جلد (۱۰) عدد (۱)
محرم الحرام سنہ ۱۳۵۶ھ

رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹر نمبر ایم ۲۹۵۰

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صمہ)
قیمت فی پرچہ (۸/)

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کیے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے۔ اس مسئلے پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہوگئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لئے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کردی! اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی۔ مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کردیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کرکے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لئے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب نہ صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت بلا جلد (عہ) انگریزی (للعہ) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت صہ انگریزی ۱۲ سکہ عثمانیہ)

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چار مینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ محرم الحرام ۱۳۵۶ھ جلد ۱۰ عدد (۱)

ضروری اطلاع: (۱) سرکار آصفیہ سررشتہ امور مذہبی کی جانب سے جن کتب خانوں اور انجمنوں اور دوسرے علمین کو یہ رسالہ بھیجا جاتا رہا ہے ان کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اس سال ان پرچوں میں ۲۵ کی تخفیف کر دی گئی ہے لہٰذا جن حضرات کو پرچہ نہ پہنچے وہ شکایت نہ فرمائیں۔

(۲) یکم اپریل سے لیے ڈاک کا محصول بڑھ گیا ہے لہٰذا آئندہ سال برما سے پانچ روپیہ کی بجائے سات روپیہ چندہ لیا جائے گا۔ منیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس اشاعت کے ساتھ "ترجمان القرآن" کی زندگی کا پانچواں سال شروع ہو رہا ہے۔ سفر کی اس نئی منزل میں قدم رکھنے سے پہلے مجھ پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے۔ پچھلے دور اِس طرح گذرتے رہے ہیں کہ ہر سال کی ابتدا میں خوف ہوتا تھا کہ شائد اب یہ پرچہ پورا سال نہ پکڑ سکے گا، اور ہر سال کے خاتمہ پر حیرت ہوتی تھی کہ آخر یہ زندہ کیسے رہ گیا۔ نشیب و فراز کے ان مسلسل تجربات اور نصرت الٰہی کے پیہم مظاہرات نے اب دل میں اس امر کا اذعان سا پیدا کر دیا ہے کہ یہ خدمت بارگاہ الٰہی میں کسی حد تک مقبول ضرور ہے اور اس مقبولیت کی بنا پر اس کے ساتھ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ کا سا معاملہ ہو رہا ہے گو ظاہر حالات کے لحاظ سے خارج میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اب بھی زمانہ کا وہی رنگ ہے جسے دیکھ دیکھ کر دل ٹوٹا جاتا تھا، ہمت بیٹھی جاتی تھی، حوصلے پست ہوئے جاتے تھے لیکن اب باطن کا وہ حال نہیں جو پہلے تھا۔ اب دل میں ایک اطمینان ہے۔ روح میں ایک سکون ہے۔ حوصلوں میں ایک نئی قوت پرواز اور عزائم میں ایک خاص طاقت ثبات محسوس ہوتی ہے۔ پہلے صبر اور توکل کے الفاظ ذہن میں تھے۔ روح میں ان کے معنی کا تحقق اب شروع ہوا ہے۔ پہلے صرف اعتقاداً یہ سمجھتے تھے کہ خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ چار سال کی مشق و تمرین کے بعد اب کچھ سمجھ میں آنے لگا ہے کہ خدا پر بھروسہ کرنے کے معنی کیا ہیں، اور اس پر بھروسہ کرنے والوں کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے۔ یہی وہ نعمت ہے، برسوں سے جس کی طلب تھی۔ اور اب کہ اس بخشش کا آغاز ہوا ہے، صمیم قلب کے ساتھ بخشنے والے کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اور ادائے شکر کے ساتھ

یہ دعا بھی کرتا ہوں کہ اس نعمت کا اتمام فرمایا جائے، کیونکہ اب جو مرحلہ درپیش ہے اس میں سب سے بڑھ کر اسی چیز کی ضرورت ہے۔ میں ایک مجاہد کے سے ایمان کا طالب ہوں۔ ایسا دل مانگتا ہوں جو سمندر کی طوفانی موجوں کے مقابلہ میں ٹوٹی ہوئی کشتی لے جانے پر بے جھجک آمادہ ہوجائے۔ ایسی روح مانگتا ہوں جو شکست کھانے اور سپر رکھ دینے کا تصور ہی نہ کر سکتی ہو۔ ایسی عزیمت مانگتا ہوں جو مادی سہاروں سے قطعاً مستغنی ہو اور تمام سہاروں کے چھوٹ جانے پر بھی نہ ٹوٹ سکے۔ ایسا ارادہ مانگتا ہوں جسے کوئی طاقت اپنے مقصد کے راستہ سے نہ ہٹا سکے۔

اس سے پہلے ہم کسی موقع پر اشارۃً کہہ چکے ہیں کہ ہندوستان میں تیزی کے ساتھ ایک نیا انقلاب آرہا ہے جو بلحاظ اپنے اثرات اور اپنے نتائج کے ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے بھی زیادہ شدید ہوگا۔ پھر اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانہ پر ایک دوسرے انقلاب کا سامان تمام دنیا میں ہورہا ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ یہ وسیع تر انقلاب ہندوستان پر اثر انداز ہو کر یہاں کے متوقع انقلاب کا رخ اچانک پھیر دے، اور اس کو ہماری توقعات سے بہت زیادہ پرخطر بنا کر چھوڑ دے۔

جو لوگ خس و خاشاک کی طرح ہر رو پر بہنے کے لیے تیار ہیں اور جن کو خدا نے اتنی سمجھ بوجھ بھی نہیں دی ہے کہ اپنے لیے زندگی کا کوئی راستہ معین کر سکیں۔ ان کا ذکر تو قطعاً فضول ہے انھیں غفلت میں پڑا رہنے دیجیے زمانہ کا سیلاب جس رخ پر بھی بہے گا وہ آپ سے آپ اسی رخ پر بہ جائیں گے اسی طرح اُن لوگوں سے بھی قطع نظر کیجیے جو آنے والی انقلابی قوتوں پر سمجھ بوجھ کر ایمان لائے ہیں اور بالارادہ اسی رخ پر جانا چاہتے ہیں جس پر زمانہ کا طوفانی دریا جا رہا ہے۔ اب صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جو مسلمان ہیں، مسلمان رہنا چاہتے ہیں، مسلمان مرنا چاہتے ہیں، اور یہ تمنا رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب زندہ رہے، اور ہماری آئندہ نسلیں محمد عربی صلعم

کی بتائی ہوئی راہ راست پر قائم رہیں۔ ان لوگوں کے لیے یہ وقت رواروی سے گذار دینے کا نہیں، بلکہ گہری سوچ اور غایت درجہ کے غور و فکر کا ہے۔ وہ اگر اس نازک وقت میں غفلت اور بے پروائی سے کام لیں گے تو ایک جرم عظیم کا ارتکاب کریں گے اور اس جرم کی سزا صرف آخرت ہی میں نہ ملے گی بلکہ اسی دنیا کی زندگی میں اُن پر چھا جائے گی۔ زمانہ کا بے درد ہاتھ ان کی آنکھوں کے سامنے تہذیب اسلامی کے ایک ایک نشان کو مٹائے گا۔ اور وہ بے بسی کے ساتھ اس کو دیکھا کریں گے۔ زمانہ ان کے قومی وجود کو ملیا میٹ کرے گا، ایک ایک کر کے ان امتیازی حدود کو ڈھائیگا جن سے اسلام غیر اسلام سے متمیز ہوتا ہے، ہر اس خصوصیت کو فنا کر دے گا جس پر مسلمان دنیا میں فخر کرتا رہا ہے، وہ یہ سب کچھ دیکھیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ ان کی آنکھیں خود اپنے گھروں میں اپنی نوخیز نسلوں کو خدا پرستی سے دور، اسلامی تہذیب سے بیگانہ اور اسلامی اخلاق سے عاری دیکھیں گی۔ اور آنسو تک نہ بہا سکیں گی۔ ان کی اپنی اولاد اُس فوج کی سپاہی بن کر اٹھے گی جسے اسلام اور اس کی تہذیب کے خلاف صف آرا کیا جائے گا۔ وہ اپنے ان جگر گوشوں کے ہاتھ سے تیر کھائیں گے اور جواب میں کوئی تیر نہ چلا سکیں گے۔ یہ انجام یقینی ہے۔ اگر کام کے وقت کو غفلت میں کھو دیا گیا۔ انقلاب کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ اس کے آثار نمایاں ہو چکے ہیں، اور اب فکر و عمل کے لیے بہت ہی تھوڑا وقت باقی ہے۔

اسلامی ہند کی تاریخ پر جو لوگ نظر رکھتے ہیں اُن سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس ملک میں اسلامی تہذیب کی بنیاد ابتدا ہی سے کمزور ہے۔ صدر اول میں اور اس سے متصل بعد کی قرنوں میں اسلامی سیلاب کی جو لہریں ہندوستان تک پہنچیں وہ زیادہ تر خس و خاشاک اور کثافتیں لے کر آئیں، اس لیے کہ اس زمانہ میں ہندوستان دارالاسلام کی آخری سرحدوں پر تھا اور وہ سب لوگ جو اسلام کے مرکزی اقتدار یا اصولی عقیدہ و مسلک کے خلاف بغاوت کرتے تھے عموماً بھاگ بھاگ کر اسی طرف آجاتے تھے۔

چنانچہ سندھ اور کاٹھیاواڑ اور گجرات وغیرہ ساحلی علاقوں میں جو گمراہیاں آج تک پائی جاتی ہیں وہ اُسی زمانہ کی یادگار ہیں۔ اس کے بعد چھٹی صدی ہجری میں جب اصل دھارے نے ہندوستان کا رخ کیا تو وہ خود عجمی کثافتوں سے بہت کچھ آلودہ ہو چکا تھا۔ امراء میں روح جہاد اور علماء میں روح اجتہاد سرد ہو چکی تھی۔ ہمارے حکمراں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کو خراج اور توسیع مملکت کی فکر تھی۔ اور ہمارے مذہبی پیشواؤں میں اکثریت ان حضرات کی تھی جن کی زندگی کا مقصد حکومت کے مناصب حاصل کرنا اور ہر قیمت پر اپنے مذہبی اقتدار کی حفاظت کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ یہاں صحیح معنوں میں کبھی اسلامی حکومت قائم ہوئی، نہ حکومت نے پوری طرح وہ فرائض انجام دیے جو شرعاً اس پر عائد ہوتے تھے، نہ اسلامی علوم کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم ہوا، نہ اشاعت اسلام کی کوئی خاص کوشش کی گئی، نہ اسلامی تہذیب کی ترویج اور اس کے حدود کی نگہداشت جیسی ہونی چاہیئے ویسی ہو سکی۔ علماء اور صوفیہ کے ایک مختصر گروہ نے بلاشبہ نہایت زرین خدمات انجام دیں اور انہی کی برکت ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں میں کچھ علم دین اور کچھ اتباع شریعت پایا جاتا ہے لیکن ایک قلیل گروہ ایسی حالت میں کیا کر سکتا تھا جب کہ قوم کے عوام جاہل اور ان کے سردار اپنے فرائض سے غافل ہوں۔

اسلام کی عام کشش سے متاثر ہو کر ہندوستان کے کروڑوں آدمی مسلمان ہوئے مگر اسلامی اصول پر ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک کی اسلامی آبادی کا سواد اعظم ان تمام مشرکانہ اور جاہلانہ رسوم و عقائد میں گرفتار رہا جو اسلام قبول کرنے سے پہلے ان میں رائج تھے۔ جو مسلمان باہر سے آئے تھے ان کی حالت بھی ہندوستانی نومسلموں سے کچھ زیادہ بہتر نہ تھی۔ ان پر عجمیت پہلے ہی غالب ہو چکی تھی۔ نفس پرستی اور عیش پسندی کا گہرا رنگ ان پر چڑھ چکا تھا۔ اسلامی تعلیم و تربیت سے وہ خود پوری طرح بہرہ ور نہ تھے۔ زیادہ تر دنیا اُنکی مطلوب تھی۔ خالص دینی جذبہ ان

میں سے بہت کم، بہت ہی کم لوگوں میں تھا، وہ یہاں آکر بہت جلدی عام باشندوں میں گھل مل گئے کچھ ان کو متاثر کیا اور کچھ ان سے متاثر ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں مسلمانوں کا تمدن اسلامیت، عجمیت اور ہندیت کی ایک معجون مرکب بن کر رہ گیا۔

عام طور پر جو طرز تعلیم یہاں رائج ہوا وہ اسی ڈھنگ کا تھا جسے انگریزوں نے بعد میں اختیار کیا۔ اس کا بنیادی مقصد حکومت کی خدمات کے لیے لوگوں کو تیار کرنا تھا۔ قرآن اور حدیث کے علوم جن پر اسلامی تہذیب کی بنیاد قائم ہے۔ یہاں کے نظام تعلیمی میں بہت ہی کم بار پا سکے۔

طرز حکومت بھی قریب قریب اسی ڈھنگ کا رہا جس کی تقلید بعد میں انگریزوں نے کی، بلکہ اپنی قومی تہذیب کی حفاظت اور ترویج اور اس کے حدود کی نگہداشت کا جتنا خیال انگریزوں نے رکھا ہے، اتنا بھی مسلمان حکمرانوں نے نہ رکھا خصوصیت کے ساتھ مغل فرمانرواؤں نے اس باب میں جس سہل انگاری سے کام لیا ہے اس کی مثال تو شائد دنیا کی کسی حکمراں قوم میں نہ مل سکے گی۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کی تعلیم اور سیاست دونوں اپنی قومی تہذیب کی حفاظت سے دستکش ہو جائیں اس کو زوال سے کوئی قوت نہیں بچا سکتی۔

گیارھویں صدی ہجری میں انحطاط اپنی آخری حدوں پر پہنچ چکا تھا، مگر عالمگیر کی طاقتور شخصیت اس کو روکے ہوئے تھی۔ بارھویں صدی کی ابتدا میں جب قصر اسلامی کا یہ آخری محافظ دنیا سے رخصت ہوا تو وہ تمام کمزوریاں یکایک نمودار ہوگئیں جو اندر ہی اندر صدیوں سے پرورش پا رہی تھیں۔ تعلیم و تربیت کی خرابی اور قومی اخلاق کے اضمحلال اور نظام اجتماعی کے اختلال کا پہلا نتیجہ سیاسی زوال کی صورت میں ظاہر ہوا۔ مسلمانوں کی سیاسی جمعیت کا شیرازہ دفعتہً درہم برہم ہوگیا۔ قومی اور اجتماعی مفاد کا تصور ان کے دماغوں سے نکل گیا۔ انفرادیت اور خود غرضی پوری طرح ان پر مسلط ہوگئی۔ ان

ایسے ہزار در ہزار خائن اور غدار پیدا ہوئے جن کا ایمان کسی نہ کسی قیمت پر خریدا جا سکتا تھا، اور جو اپنے ذاتی فائدہ کے لیے بڑے سے بڑے قومی مفاد کو بے تکلف بیچ سکتے تھے۔ ان میں لاکھوں بندگانِ شکم پیدا ہوئے جن سے ہر دشمن اسلام تھوڑی سی رشوت یا حقیر سی تنخواہ دے کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر قسم کی بدتر سے بدتر خدمت لے سکتا تھا۔ ان کے سوادِ اعظم سے قومی غیرت اور خودداری اس طرح مٹ گئی کہ دلوں میں اسکا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ وہ دشمنوں کی غلامی پر فخر کرنے لگے۔ غیروں کے بخشے ہوئے خطابات اور مناصب میں انکو عزت محسوس ہونے لگی۔ دین اور ملت کے نام پر جب کبھی ان سے اپیل کی گئی وہ پتھروں سے ٹکرا کر واپس آئی اور جب کوئی حامی دین و ملت اقتدار قومی کے گرتے ہوئے قصر کو سنبھالنے اٹھا، اس کا سر خود اس کی اپنی قوم کے بہادروں نے کاٹ کر دشمنوں کے سامنے پیش کر دیا۔

اس طرح ڈیڑھ صدی کے اندر اسلام کا سیاسی اقتدار ہندوستان کی سرزمین میں بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا، اور سیاسی اقتدار مٹتے ہی یہ قوم، افلاس، غلامی، جہالت اور بد اخلاقی میں مبتلا ہو گئی۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ دراصل سیاسی انقلاب کی تکمیل اور ایک دوسرے انقلاب کی تمہید تھا۔ جن کمزوریوں نے مسلمانوں سے سیاسی اقتدار چھینا تھا وہ سب علیٰ حالہٖ قائم تھیں۔ اور ان پر مزید کمزوریوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کے اندر اسلامی تہذیب کی بنیاد پہلے سے کمزور تھی اس کمزوری نے جب حکومت کے منصب سے ان کو ہٹا دیا، اور افلاس و غلامی کی دوہری مصیبت میں وہ گرفتار ہوئے تو دوسری اور کمزوریاں رو بکار آ گئیں۔

دین اور اخلاق اور تہذیب اور تمدن یہ سب چیزیں بلند تر انسانیت سے تعلق رکھتی ہیں، اور ان کی قدر و عزت وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جو حیوانیت سے بالاتر ہوں۔ پیٹ اور روٹی اور کپڑا اور آسایشِ بدن اور لذاتِ نفس وہ چیزیں ہیں جو انسان کی حیوانی ضروریات سے تعلق رکھتی ہیں

اور جب انسان مقام حیوانی سے قریب تر ہوتا ہے تو اس کی نگاہ میں یہی چیزیں زیادہ اہم ہوتی ہیں حتٰی کہ وہ ان کی خاطر بلند تر انسانیت کی ہر متاع گراں مایہ کو نہ صرف قربان کر دیتا ہے بلکہ حیوانی پستی کی آخری حدوں پر پہنچ کر اس میں یہ احساس بھی باقی نہیں رہتا کہ میرے لیے کوئی چیز ان چیزوں سے اعلیٰ اور ارفع بھی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کا مسلمان جب اپنا سیاسی اقتدار کھو رہا تھا اس زمانہ میں اس کی انسانیت پر حیوانیت غالب آ چکی تھی، مگر انسانیت بالکل فنا نہیں ہوئی تھی، اس لیے وہ پیٹ اور بدن پر انسانیت کی گراں قدر متاعوں کو قربان تو کر رہا تھا، مگر اس کو یہ احساس ضرور تھا کہ یہ متاعیں گراں قدر ہیں اور کسی نہ کسی طرح ان کی بھی حفاظت کرنی چاہیے۔ لیکن جب وہ سیاسی اقتدار کھو چکا تو افلاس نے پیٹ اور بدن کے سوال کو ہزار گنا زیادہ اہم بنا دیا، اور غلامی نے غیرت اور خودداری کے تمام احساسات کو مٹانا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی انسانیت روز بروز پست ہوتی چلی گئی اور حیوانیت کا اثر بڑھتا اور چڑھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ابھی ایک صدی بھی پوری نہیں گزری ہے۔ اور حال یہ ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل پہلی نسل سے زیادہ نفس پرست، اور بندۂ شکم اور آسایشِ بدن کی غلام بن کر اٹھ رہی ہے۔ ستر برس پہلے وہ مغربی تعلیم کی طرف یہ کہہ کر گئے تھے کہ ہم صرف اپنی حیوانی ضروریات پوری کرنے کے لیے اودھر جا رہے ہیں، اپنے دین و اخلاق اور اپنی قومی تہذیب و تمدن کو ہم کھونا نہیں چاہتے۔ اور واقعہ بھی یہ تھا کہ اس وقت تک یہ چیزیں ان کی نگاہ میں کافی اہمیت رکھتی تھیں، لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، وہ بنیادی کمزوریاں جنہوں نے ان کو حکومت کے منصب سے ہٹایا۔ ان میں پہلے سے موجود تھیں، اور وہ نئی کمزوریاں جو غلامی و افلاس کی حالت میں فطرۃً پیدا ہوتی ہیں، ان کے اندر تیزی سے پیدا ہو رہی تھیں۔ ان دونوں قسم کی کمزوریوں کی بدولت ایک طرف دین و اخلاق کی اہمیت اور قومی تہذیب و تمدن کی قدر و عزت روز بروز ان میں کم ہوتی چلی گئی۔ دوسری طرف خود غرضی اور نفسانیت کے روز افزوں غلبہ نے اُن کو ہر اس شخص کی غلامی پر

آمادہ کر دیا جو ان کو کچھ مال اور جاہ اور اپنے ہم جنسوں میں کچھ سربلندی عطا کر سکتا ہو خواہ ان چیزوں کے بدلہ میں وہ انسانیت کے جس گوہر بیش بہا کو چاہے خرید لے۔ تیسری طرف انفرادیت اور خود پرستی جو ڈہائی سو برس سے ان کی قومیت کو گھن کی طرح لگی ہوئی ہے، انتہائی حد کو پہنچ گئی یہاں تک کہ اجتماعی عمل کی کوئی صلاحیت ان میں باقی نہیں رہی اور وہ تمام صفات ان سے نکل گئیں جس کی بدولت ایک قوم کے افراد اپنے قومی مفاد کی حفاظت اور اپنے قومی وجود کی حمایت کے لیے مجتمع ہو سکتے اور مشترک جد و جہد کر سکتے ہیں۔

یہاں اتنا موقع نہیں کہ اس دوسرے انقلاب کے تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا سکے۔ تاہم مختصراً اس کے چند نمایاں پہلوؤں کی طرف ہم اشارہ کریں گے تاکہ ہندوستان میں اسلام کی موجودہ پوزیشن واضح طور پر سامنے آجائے اور یہ اندازہ کیا جا سکے کہ اب جو تیسرا انقلاب سامنے آرہا ہے، وہ ان حالات میں مسلمانوں پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔

جس روز سے برٹش امپیریلزم نے ہندوستان میں قدم رکھا ہے، اُسی روز سے اس کی یہ مستقل پالیسی رہی ہے کہ مسلمانوں کا زور توڑا جائے۔ اسی غرض کے لیے اسلامی ریاستوں کو مٹایا گیا اور اس نظام عدل و قانون کو بدلا گیا جو صدیوں سے یہاں قائم تھا۔ اسی غرض کے لیے انتظام مملکت کے قریب قریب ہر شعبے میں ایسی تدبیریں اختیار کی گئیں جن کا مآل یہ تھا کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے تباہ و برباد کر دیا جائے اور ان پر رزق کے دروازے بند کر دیے جائیں، چنانچہ گذشتہ ڈیڑھ دو سو سال کے اندر اس پالیسی کے جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں وہ یہ ہیں کہ جو قوم کبھی اس ملک کے خزانوں کی مالک تھی، وہ اب روٹیوں کی محتاج ہو چکی ہے اس کی معیشت کے ذرائع سے ایک ایک کر کے محروم کر دیا گیا ہے، اور اب اس کی ۹۰ فیصدی آبادی غیر مسلم سرمایہ دار کی معاشی غلامی میں مبتلا ہے۔ ساہوکار سے برٹش امپیریلزم کا مستقل اتحاد ہے اور برطانوی نظام

عدالت اس کے لیے وہی خدمت انجام دے رہا ہے جو سودخوار پٹھان کے لیے اس کا ڈنڈا انجام دیتا ہے۔

سیاسی اقتدار سے محروم ہونے کے بعد مسلمانوں میں جاہ اور عزت کی بھوک پیدا ہوئی اور معاشی وسائل سے محروم ہونے کے بعد روٹی کی بھوک۔ ان دونوں چیزوں کے حصول کا دروازہ صرف ایک ہی رکھا گیا اور وہ مغربی تعلیم کا دروازہ تھا۔ روٹی اور عزت کے بھوکے لاکھوں کی تعداد میں ادھر لپکے۔ وہاں ہاتف غیب نے پکار کر کہا کہ آج روٹی اور عزت مسلمان کے لیے نہیں ہے۔ یہ چیزیں اگر چاہتے ہو تو نامسلمان بن کر آؤ۔ اپنے دل کو، اپنے دماغ کو، اپنے دین اور اخلاق کو، اپنی تہذیب اور آداب کو، اپنے اصول حیات اور طرز معاشرت کو، اپنی غیرت اور خودداری کو قربان کرو، تب روٹی کے چند ٹکڑے اور عزت کے چند کھلونے تم کو دیئے جائیں گے۔ انہوں نے خیال کیا کہ بہت ہی سستے داموں بہت ہی قیمتی چیز مل رہی ہے۔ بیچو اس پرانے کباڑخانے کو۔ یہ چیزیں جو روٹی اور خطاب و منصب جیسی بیش بہا چیزوں کے معاوضے میں مانگی جا رہی ہیں، آخر ہیں کس کام کی۔ انہیں تو رہن رکھ کر بنیے سے چار پیسے بھی نہیں مل سکتے۔

مسلمان جب مغربی تعلیم کی طرف گئے تو یہی کچھ سمجھ کر گئے۔ زبانوں نے گو ایسا نہیں کہا۔ مگر جذبات اور تخیلات تو ایسے ہی کچھ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کم و بیش ۹۰ فی صدی لوگوں پر اس تعلیم کے وہی اثرات ہوئے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ اسلامی تعلیم میں وہ قطعی کورے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کو ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے۔ اسلامی لٹریچر کی کوئی چیز ان کی نظروں سے نہیں گذرتی۔ وہ کچھ نہیں جانتے کہ اسلام کیا ہے اور مسلمان کس کو کہتے ہیں اور اسلام اور غیر اسلام میں کیا چیز ما بہ الامتیاز ہے۔ خواہشات نفس کو انہوں نے اپنا معبود بنا لیا ہے۔ اور یہ معبود انہیں اس مغربی تہذیب کی طرف لیے جا رہا ہے جس نے نفس کی ہر خواہش اور لذت نفس کی ہر طلب کو پورا کرنے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ وہ مسلمان ہونے پر نہیں بلکہ ماڈرن ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ وہ اہل فرنگ کی ایک ایک ادا پر جان نثار کرتے ہیں۔ لباس میں معاشرت میں کھانے اور رہنے میں

میل جول اور بات چیت میں حتّٰی کہ اپنے ناموں تک میں وہ ان کا ہو بہو چربہ بن جانا چاہتے ہیں۔ انھیں ہر اس طریقہ سے نفرت ہے جس کا حکم مذہب نے ان کو دیا ہے، اور ہر اس کام سے رغبت ہے جس کی طرف مغربی تہذیب انھیں بلاتی ہے۔ نماز پڑھنا ان کے ہاں معیوب ہے۔ اتنا معیوب کہ جو شخص نماز پڑھتا ہے اسے ان کی سوسائٹی میں بنایا جاتا ہے، اور اگر بنانے کی جرأت نہیں ہوتی تو کم از کم حقارت آمیز حیرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ آخر یہ کونسی مخلوق ہے جو اب تک خدا کا نام لیے جا رہی ہے۔ بخلاف اس کے سینما جانا ان کے نزدیک نہ صرف مستحسن بلکہ ایک مہذب انسان کے لوازم حیات میں سے ہے اور جو شخص اس سے اجتناب کرتا ہے اس پر حیرت کی جاتی ہے کہ یہ کس قسم کا تاریک خیال ملا ہے جو بیسویں صدی کی اس برکت عظمیٰ سے محروم رہنا چاہتا ہے۔ ان میں اب وہ طبقہ سرعت سے بڑھ رہا ہے جو مذہب اور خدا سے اپنی بیزاری کو چھپانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا، اور صاف کہنے لگا ہے کہ ہمیں اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ چیز اب تک ہمارے مردوں میں تھی، مگر اب عورتوں میں بھی پہنچ رہی ہے۔ جو طبقے ہماری سوسائٹی کے پیش رو اور مقتدا ہیں وہ اپنی عورتوں کو کھینچ کر باہر لا رہے ہیں۔ ان کو بھی اسلام اور اس کی تہذیب سے بیگانہ اور مغربی تہذیب اور اس کے طور طریقوں اور اس کے تخیلات سے آراستہ کیا جا رہا ہے۔ عورت میں انفعال اور تاثر کا مادہ فطری طور پر مردوں سے زیادہ ہے۔ جو راستہ مردوں نے ستر برس میں طے کیا ہے، عورتیں اس کو ان سے بہت جلدی طے کریں گی اور ان کی گودوں میں جو نسلیں پرورش پا کر اٹھیں گی ان میں شاید اسلام کا نام بھی باقی نہ رہے گا۔

خود غرضی انفرادیت اور نفس پرستی کے غلبہ کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں سے قومیت کا احساس مٹتا جا رہا ہے اور ان کی اجتماعی طاقت فنا ہو رہی ہے۔ پندرہ سال سے اُن کے اندر سخت انتشار برپا ہے۔ ان کی کوئی قومی پالیسی نہیں، کوئی اجتماعی ہیئت نہیں۔ کوئی ایک شخص نہیں جو ان کا لیڈر ہو۔ کوئی ایک جماعت نہیں جو ان کی نمائندہ ہو۔ کسی بڑی سے بڑی قومی مصیبت پر بھی وہ جمع نہیں ہو سکتے۔ ایک بن سری فوج ہے جو راس کماری سے پشاور تک بکھری ہوئی ہے۔ ایک ریوڑ ہے جس میں کوئی نظم نہیں۔ ایک بھیڑ ہے جس میں کوئی رابطہ نہیں۔ ہر فرد آپ ہی اپنا لیڈر اور اپنا

انجمنیں اور جمعیتیں ہزاروں ہیں، مگر حال یہ ہے کہ ایک ہی انجمن کے ارکان باہم برسرپیکار ہو جاتے ہیں اور علانیہ ایک دوسرے کے مقابلے پر آتے ہیں۔ اول اول ان کو اپنی اُس طاقت کا گھمنڈ تھا جو کبھی ان میں پائی جاتی تھی، مگر جن قوموں نے دس سال کے اندر ان کو بتا دیا کہ طاقت کس چیز کا نام ہے۔ یہ آپس میں لڑتے رہے اور وہ منظم ہو گئیں انہوں نے خود اپنے سرداروں میں سے ایک ایک کو کھینچ کر زمین پر گرا دیا، اور اُنہوں نے ایک سردار کی اطاعت کر کے اسے تمام ملک میں بے تاج کا بادشاہ بنا دیا۔ یہ اپنی قوتوں کو خود اپنی تخریب میں ضائع کرتے رہے اور وہ حکومت سے پیہم مقابلے کر کے اپنا زور بڑھاتے رہے۔ اِنہوں نے ملک کے تازہ انتخابات میں شخصی اغراض کو سامنے رکھا اور بیسیوں پارٹیاں بن کر اسمبلیوں میں پہنچے۔ اُنہوں نے اجتماعی اغراض کو مقدم رکھ کر تمام ملک میں منضبط جدوجہد کی اور ایک مستحکم جمعیت کی شکل میں حکومت کے ایوانوں پر قبضہ کر لیا۔ ان نتائج کو دیکھ کر ہندوستان کے مسلمانوں پر اب وہی اثر ہو رہا ہے جو ایک باقاعدہ فوج کو دیکھ کر منتشر انبوہ پر ہوا کرتا ہے۔ ایک منظم جماعت کی کامیابی سے وہ مرعوب ہو گئے ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ حکومت کا اقتدار اب بہت جلدی انگریز کے ہاتھ سے منتقل ہو کر اسی جماعت کے ہاتھ میں آنے والا ہے۔ لہٰذا اب وہ سمت قبلہ بدلنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان کے سجدوں کا رخ وائسریگل لاج سے ہٹ کر آنند بھون کی طرف پھرنے لگا ہے اور آج نہیں تو کل پھر کر رہے گا۔

یہ ہے مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن۔ اب دیکھیے کہ جو انقلاب آ رہا ہے وہ کس نوعیت کا ہے۔

اب تک ہندوستان کی حکومت ایک ایسی قوم کے ہاتھ میں رہی ہے۔ جو اس ملک کی آبادی میں آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے اثرات تو وہ تھے جو اوپر آپ نے دیکھ لیے۔ اب جو جماعت برسر اقتدار آ رہی ہے وہ ملک کی آبادی کا سواد اعظم ہے۔ گذشتہ ڈھائی سو برس میں مسلمانوں نے جو زنانہ خصوصیات اپنے اندر پیدا کی ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر اندازہ کیجیے کہ اس قوم کو جدید ہندی قومیت میں جذب ہوتے کتنی دیر لگیگی۔

جدید ہندی قومیت کا لیڈر وہ شخص ہے جو مذہب کا علانیہ مخالف ہے ہر اس قومیت کا دشمن ہے جس کی بنا کسی مذہب پر ہو، اس نے اپنی دہریت کو کبھی نہیں چھپایا، یہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ وہ کمیونزم پر ایمان رکھتا ہے

اس امر کا بھی وہ خود اعتراف کر چکا ہے کہ میں دل اور دماغ کے اعتبار سے مکمل فرنگی ہوں۔ یہ شخص ہندوستان کی نوجوان نسل کا رہنما ہے اور اس کے اثر سے وہ جماعت نہ صرف غیر مسلم قوموں میں بلکہ خود مسلمانوں کی نوخیز نسلوں میں بھی روز افزوں تعداد میں پیدا ہو رہی ہے جو سیاسی حیثیت سے ہندوستانی وطن پرست، اور اعتقادی حیثیت سے کمیونسٹ اور کلچرل حیثیت سے مکمل فرنگی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ڈھنگ پر جو قومیت تیار ہو رہی ہے اس سے مغلوب اور متاثر ہو کر ہندوستان کے مسلمان کتنی مدت تک اپنی قومی تہذیب کے باقی ماندہ آثار کو زندہ رکھ سکیں گے؟

مسلمانوں کے انتشار اور بدنظمی کو دیکھ کر اب ان کے مستقل قومی وجود کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کیا جا رہا ہے جن لوگوں کی عمریں عوام کی رہنمائی اور اقوام کی نبض شناسی میں گذری ہیں ان سے یہ راز چھپا نہیں رہ سکتا کہ اس قوم کا شیرازۂ قومیت بڑی حد تک بکھر چکا ہے، وہ خصوصیات اس سے فنا ہو رہی ہیں جو کسی جماعت کو ایک قوم بناتی ہیں۔ اب اس کے افراد کسی دوسری قومیت میں جذب ہونے کے لیے کافی حد تک مستعد ہو چکے ہیں یہی چیز ہے جس کی بنا پر اب یہ اسکیم بنائی جا رہی ہے کہ مسلمانوں کی جماعتوں کو خطاب کرنے کے بجائے ان کے افراد کو خطاب کیا جائے اور ان کو جدا جدا اکائیوں کی شکل میں رفتہ رفتہ اپنی طرف کھینچا جائے۔ یہ کس چیز کی تمہید ہے؟ جس شخص کو اللہ نے تھوڑی سی بصیرت بھی عطا کی ہے وہ اس کو سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ مسلمان انگریزی اقتدار کے زمانہ میں جس کیرکٹر کا اظہار کرتے رہے ہیں اس کو سامنے رکھ کر غور کیجیے۔ کیا اسمبلیوں کی نشستیں اور آیندہ معاشی اور سیاسی فائدوں کا لالچ ان کے افراد کو فوج در فوج اُس طرف کھینچ کر نہ لے جائیگا جس طرف انھیں کھینچا جا رہا ہے؟ اور کیا یہ وہی سب کچھ نہ کریں گے جو انگریزی اقتدار کی غلامی میں کر چکے ہیں؟

مسلمانوں کی اصلی کمزوری کو تاڑ لیا گیا ہے۔ آپ نے سنا کہ انھیں کھینچنے کے لیے جو صدا بلند کی جا رہی ہے وہ کونسی صدا ہے؟ وہی پیٹ اور روٹی کی ذلیل صدا جو ہمیشہ خود غرض اور شکم پرست حیوانات کو اپنی طرف کھینچتی رہی ہے اُن سے کہا جا رہا ہے کہ تہذیب کیا بلا ہے؟ اور تمہاری تہذیب کی خصوصیت بجز پاجامے اور ڈاڑھی کے اور ہے ہی کیا؟ ہمیں آخر کونسی اہمیت ہے؟ اصلی سوال تو پیٹ کا سوال ہے! اسی سوال کو حل کرنے کے لیے ہم اٹھے ہیں! اب اگر دہریت اور

کمیونزم کا زہر بھی تھوڑا تھوڑا ہر نوالے کے ساتھ پیٹ میں اتر جائے تو اس سے گھبرانے کی کوئی وجہ نہیں۔ جو قوم اس سے پہلے انہی نوالوں کے ساتھ الحاد و فرنگیت کا زہر بھی اتار چکی ہے۔ اس کے حلق میں ویسی ہی چند اور چنیاں کیوں پھنسنے لگیں۔

اس نوعیت کا ہے وہ انقلاب جو اب آرہا ہے۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ اس انقلاب کے دامن سے وابستہ ہیں ان کی زندگیاں ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی صورتیں، ان کے لباس، ان کی بات چیت، ان کی چال ڈھال، ان کے آداب و اطوار، ان کے خیالات سب کچھ ہمارے سامنے اُس مسلمان کا نمونہ پیش کر رہے ہیں جو اس آنے والے انقلاب میں پیدا ہوگا۔ ہم ابھی سے دیکھ رہے ہیں کہ اس دور میں مسٹروں کے بجائے مہاشے اور مسوں کے بجائے شریمتیاں ہمارے ہاں پیدا ہوں گی۔ گڈ مارننگ کی جگہ نمستے لے گا۔ ہیٹ کی جگہ گاندھی کیپ ہوگی۔ پیشانیوں پر قشقے اور بندیاں نظر آئیں گی۔ دماغ اور دل اور جسم سب اپنا رنگ بدلیں گے، اور کونوا قردۃ خاسئین کی لعنت جو ان پر ستر سال پہلے نازل ہوئی تھی، ایک دوسری شکل میں ظاہر ہو کر رہے گی۔

دنیا میں انقلاب کی رفتار بہت تیز ہے اور روز بروز تیز ہوتی چلی جا رہی ہے۔ پہلے جو تغیرات صدیوں میں ہوتے تھے۔ اب وہ برسوں میں ہو رہے ہیں۔ پہلے انقلاب بیل گاڑیوں اور ٹٹوؤں پر سفر کیا کرتا تھا، اب ریل اور تار اور اخبار اور ریڈیو پر حرکت کر رہا ہے۔ آج وہ حالت ہے کہ

یک لحظہ غافل بودہ ام صد سالہ راہم دور شد

اگر ہندوستان کے باہر کوئی اچانک واقعہ نہ بھی پیش آیا تب بھی اس متوقع انقلاب کے رونما ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگے گی۔ اور اگر کوئی عالمگیر جنگ چھڑ گئی جو قضائے مبرم کی طرح دنیا کے سر پر لٹک رہی ہے تو غالباً فیصلہ [illegible] زیادہ قریب آجائے گا۔

مقالات

نکاح کتابیہ

از جناب مولوی صدرالدین صاحب مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڈھ

یورپ کی تہذیب مشرقی ممالک پر جس حیرت انگیز سرعت کے ساتھ قابض ہوتی چلی جارہی ہے ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں اور اس کے جو مضر اثرات پیدا ہورہے ہیں وہ بھی محتاج بیان نہیں۔ مشرق کا مذہب اور اس کا تمدن دونوں مساوی طور پر اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی کا یہ کس قدر افسوس ناک مظاہرہ ہے کہ ہم دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگنے کے بجائے خود اپنے ہی کو غیروں کے رنگ میں رنگتے جارہے ہیں۔ اور اسلامی تہذیب و معاشرت کو چھوڑ کر نہ صرف اپنی سیزدہ صد سالہ روایات کو محو کر رہے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ایمان اور اسلام کی بھی بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں۔ ایک طرف ہماری تہذیب اور ہمارا مذہب ہے جس کے بندھن شگاف پر شگاف پڑتے جارہے ہیں۔ دوسری طرف تہذیب مغربی کا سیلاب ہے جو ان شگافوں میں سے روز افزوں تیزی کے ساتھ بڑھتا چلا آرہا ہے۔ مغربی فتنہ اپنی گوناگوں رنگینیوں کے ساتھ مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اسلامی ماحول میں ایک وبا کی طرح پھیل جاتا ہے۔

ان فتنوں میں سب سے زیادہ خطرناک اور روح اسلام کو پیام ہلاکت دینے والا فتنہ "مغربی حسن" ہے ہر سال ہزاروں کی تعداد میں مغربی ساحرات اپنی ایمان سوز ادائیں لے کر ساحل ہند پہ اترتی ہیں اور ملک کا تعلیم یافتہ اور "مہذب طبقہ" اپنی متاع جان و ایمان لے کر ان کے سامنے حاضر ہو جاتا ہے۔ یہ بے پناہ طوفان یورپین فتوحات کا ایک زبردست حربہ ہے جس کی طرف اگر ہمارے ارباب حل وعقد اور ملی رہنماؤں نے پوری توجہ نہ کی تو انھیں یقین رکھنا چاہیے کہ اسلامی تاریخ کے آئندہ صفحات میں وہ ایک افسوسناک باب کا اضافہ کریں گے۔

گر افسوس تو یہ ہے کہ اس فتنہ کو مذہبی عدالتوں سے مدافعت کے بجائے سند جواز حاصل ہو رہی ہے آج کی صحبت میں چاہتا ہوں کہ کتاب وسنت کی روشنی میں وقت کے اس اہم ترین مسئلہ کی حقیقت دریافت کروں اور ساتھ ہی سیاسی اور تمدنی نقطۂ نظر سے بھی ازدواج بالاجانب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالوں۔

قرآن میں ایک جگہ ہے:-

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ (مائدہ ۱:) اور تمہارے لئے جائز ہے ان لوگوں کی عفیفہ عورتوں سے نکاح جن کو تم سے قبل کتاب دی گئی۔

اس آیت کے عموم اور ظاہری الفاظ سے متبادر ہوتا ہے کہ جو لوگ بھی اہل کتاب ہیں ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے خواہ ان کا عقیدہ اصل تعلیمات سے کتنا ہی بعید کیوں نہ ہو کیونکہ یہاں صرف اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ کی قید ہے اور قرآن نے بلا امتیاز اعمال وعقائد ہر فرقہ اور ہر عقیدے کے یہود و نصاریٰ کو لفظ اہل کتاب سے تعبیر کیا ہے۔

یہی ایک آیتہ ہے جس کی آڑ میں اتنا عظیم الشان فتنہ اسلامی ممالک میں بویا جا رہا ہے اور لوگوں کے لیئے اباحت کے دروازے کھل گئے ہیں لیکن میرے خیال میں آیتہ مذکورہ کا یہ مفہوم کسی طرح سے بھی روح اسلام کی ہم نوائی اور دیگر نصوص کی مطابقت نہیں کرتا، اور نہ اسلامی تعلیمات کا فلسفہ کبھی اس کی اجازت دے سکتا ہے بیشک اس آیت میں نکاح کتابیات کی حلت کا صریحی بیان موجود ہے لیکن اگر دوسرے نصوص سے آنکھیں بند نہ کرلی جائیں تو ماننا پڑتا ہے کہ یہ حکم اہل کتاب کے ایک خاص فرقہ سے متعلق تھا جو اپنی گوناگون خوبیوں کی وجہ سے دیگر فرق ضالہ سے ممتاز تھا۔

اس اجمال کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے اہل کتاب کے مختلف فرقوں کے متعلق خدا کے آخری مقدس اور مہیمن کلام پر ایک تفصیلی نظر کرنے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی نکاح کے جواز وعدم جواز کے متعلق جو آیات ہیں ان کا تتبع بھی لابدی ہے۔

کافرہ اور مشرکہ کی حرمت کے بارے میں تو شاید کسی بحث تمحیص کی مطلقاً ضرورت نہیں قرآن کا کھلا ہوا ارشاد موجود ہے۔

لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ — مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں

اسی طرح کافرہ کے بارہ میں بھی حکم ناطق موجود ہے۔

لَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ — کافر عورتوں کی عصمتوں پر قبضہ نہ رکھو۔

ظاہر ہے کہ ان آیات میں از دواج کی علت سوائے "شرک" اور "کفر" کے دوسری کوئی شئے نہیں ہو سکتی چنانچہ پہلی آیت میں تو حَتّٰى يُؤْمِنَّ کہکر اس حقیقت کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ بھی کر دیا، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔

یہ تو مسلم ہے کہ ان کے مختلف فرقے تھے جن کے عقائد ایک دوسرے سے جداگانہ تھے چنانچہ قرآن نے ایک ہی مقام پر نصاریٰ کے دو فرقوں کا ذکر کرکے ان کی اساسی گمراہیوں کو بیان کیا ہے اور کھلے لفظوں میں ان کو کافر کہا ہے۔ پہلے فرقہ کی تکفیر جس کا نام مفسرین کرام نے فرقۂ یعقوبیہ تبلایا ہے قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ۔ (مائدہ) — ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے۔

اسی طرح دوسرے فرقہ کے متعلق ایسا ارشاد ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ — وہ کافر ہیں جنہوں نے کہا کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے

اب اسی آیت حق نما میں یہودیت کا بھی عکس دیکھ لیجیے کہ ان کا ایمان کفر اور شرک کے داغ دھبوں سے کہاں تک محفوظ تھا۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ (مائدہ) — اُن اسرائیلیوں پر جنھوں نے کفر کیا تھا داؤد اور عیسیٰ علیہما السلام کی زبان سے لعنت کی گئی۔

ایک جگہ اور قرآن ایسی ہی لعنت کا ذکر کرتا ہے۔

وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ۔ لیکن خدا نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی۔

علاوہ بریں توراۃ میں سے بعض فرقوں کے شرک میں مبتلا ہو جانے کی تفصیلات مذکور ہیں۔

لیکن قرآن کی ان آیات سے جن میں ان مغضوب اور گمراہ اقوام کی روحانی نجاستوں اور اعتقادی بربادیوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے یہ لازم نہیں آتا کہ ساری کی ساری امت اسی نحوست اور ملعونیت کا شکار تھی۔ بیشک اکثریت تو انھیں کور بختوں کی تھی جن کی متاع ایمان کفر اور شرک کے ہاتھوں بک چکی تھی مگر ایک گروہ پھر بھی حق پسندوں کا موجود تھا جن کے قلوب میں ایمان کا حقیقی نور جگمگا رہا تھا اور جن کے اعتقادات حقہ ان کی اہواء و آراء کے سانچے میں نہیں ڈھالے گئے تھے، چنانچہ قرآن نے جہاں بھی ان کی بداعمالیوں اور بداعتقادیوں پر نکتہ چینی کی ہے وہاں پوری قوم کو سامنے نہیں رکھا ہے۔ آیۃ لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب میں من تبعیضیہ استعمال کر کے اہل کتاب کو دو گروہوں میں بانٹ دیا ہے یعنی اہل کفر اور اہل حق۔ ایک دوسرے مقام پر عام اہل کتاب اور اس فرقۂ خاص کو بالکل صریح الفاظ میں الگ الگ کر دیا ہے۔

وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ۔ اور بیشک ان میں سے ایک گروہ حق کو چھپاتا ہے۔

اسی طرح جگہ جگہ اس حق آگاہ اور حق پرست جماعت کو عام بدبختوں اور گمراہوں سے الگ کر کے قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے چنانچہ یہود کی شرارتوں اور ان کی علمی و عملی خیانتوں کا جہاں ذکر کیا ہے وہاں بھی فرمایا ہے۔

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ اور تو برابر ان کی خیانتوں پر مطلع ہوتا رہے گا انھیں سے چند لوگوں کے سوا۔

یعنی ان میں چند ارباب حق بھی موجود ہیں جو تحریف اور خیانت جیسے قبیح جرموں سے مجتنب اور اپنی خطری

سعادتوں کی بنا پر اب تک حق کا سررشتہ تھامے ہوئے ہیں ایک جگہ سورہ اعراف میں تو صاف صاف کہدیا ہے کہ

وَمِنْ قَوْمِ مُوسَىٰٓ أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِۦ يَعْدِلُونَ ۔ اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ہے جو حق کی راہ تبلاتا اور اسی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔

اور بالآخر یہی لوگ قبول حق کی فطری صلاحیتوں کی بنا پر رفتہ رفتہ حلقہ بگوش اسلام ہوتے گئے جیسا خود قرآن ہی کا ارشاد ہے۔

لَّٰكِنِ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُونَ يُؤْمِنُونَ ۔ الآیۃ لیکن ان (یہود) میں سے جو راسخین فی العلم ہیں وہ اور مومنین ایمان رکھتے ہیں۔ الخ۔

یہود کی طرح نصاریٰ میں بھی ایک گروہ موجود تھا جو آسمانی بادشاہت کے ظل عاطفت سے ابھی باہر نہیں نکلا تھا، نہ دوسرے فرقوں کی طرح اپنی متاع ایمان برباد کرچکا تھا اور نہ اس کے اعتقادات کا چشمۂ صافی شرک کی کدورتوں اور نجاستوں سے ملوث ہوا تھا، قرآن ان کی میانہ روی کو یوں سراہتا ہے۔

وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم ۚ مِّنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ۔ اگر وہ قائم رکھتے توریت اور انجیل کو اور اس چیز کو جو ان کے رب کی جانب سے اُن پر نازل ہوئی تو کھاتے اوپر سے اور اپنے پیروں تلے سے (ہاں) ان میں کچھ لوگ راہ راست پر (ضرور) ہیں لیکن اکثر بدعمل ہیں۔

بلکہ یہودیوں کی بہ نسبت نصاریٰ میں حق پرستی کا مادہ زیادہ پایا جاتا تھا۔ اور ان کے اندر ایک اچھا خاصہ گروہ اسی "راہ اعتقاد" کا راہ رو تھا جس کی سلامت روی اور حق نوازی کا اعتراف قرآن ان مدحیہ الفاظ میں کرتا ہے۔

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ جب وہ رسول پر اترے ہوئے کلام کو سنتے ہیں تو تم دیکھتے

اَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ الآیۃ۔ جو ان کی آنکھوں کو کہ بے اختیار ابلی پڑتی ہیں بوجہ حق کے پہچاننے کے۔

چنانچہ نجاشی شہنشاہ حبش اس حق پرست گروہ کے باطنی کمالات کا ٹھیک آئینہ ہے، اس کے پوچھنے پر حضرت جعفر نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جب قرآنی نقطہ نظر پیش کرکے کہا کہ حضرت عیسیٰ خدا کے ایک برگزیدہ پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہیں تو اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ خدا کی قسم عیسیٰ اس کے علاوہ ایک تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ اہل کتاب خواہ وہ عیسائی ہوں یا یہودی علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے مختلف جماعتوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اکثر تو اپنے نور فطرت کے فیضان کو کھو کر اپنی اہوا و اَمانی کو دین اور شریعت بنا بیٹھے تھے لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو خدا کی دی ہوئی شریعت کے سچے پیرو تھے۔

اب شروع سے آخر تک کی تفصیل کو نگاہ کے سامنے رکھیے۔ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کی اباحت۔ لَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ اور لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ۔ کی تحریم نیز اہل کتاب کے ان مختلف الاعتقاد فرقوں کے متعلق قرآنی احکام اور تصریحات سب کو ملا کر غور کرنے سے عقدہ خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ جب کفر اور شرک حرمت نکاح کی علت ٹھیری تو آیت جواز کے حکم میں عام اہل کتاب جن کے کفر اور شرک کا اعلان قرآن بار بار کرتا ہے نہیں داخل ہو سکتے بلکہ وہی لوگ اس کے تحت میں آئیں گے جو خدا کی بتائی ہوئی راہ پر ابھی تک قائم ہیں اور جو لوگ کہ بتدریج اسلامی بادۂ حقیقت کے ذوق آشناؤں میں داخل ہوتے گئے۔ جلد یا بدیر۔

چنانچہ فقہائے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعض مخفی اشارات اور اقوال سے بھی اسی حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس آیت کے عموم سے نصاریٰ بنی تغلب کو مستثنیٰ کرتے ہوئے فرمایا لیسوا علی النصرانیۃ ولم یاخذوا منہا

۱۷ شرب الخمر یعنی نصرانیت کو ان سے کوئی تعلق نہیں انہوں نے مے نوشی کے سوا اس سے کچھ بھی نہ لیا۔

سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر تفقہ فی الدین کی نعمت کتنوں کو ملی ہے صاف فرماتے ہیں۔

خدا نے جب مشرک کے نکاح سے منع فرمایا ہے تو الوہیت عیسیٰ کے اعتقاد سے بڑھ کر شرک عظیم اور کیا ہو سکتا ہے

پھر نکاح دائمی محبت اور تعلق کا ایک زبردست عہد و پیمان ہوتا ہے اور قرآن معاندین حق اور اعدائے اسلام سے اس قسم کے گہرے تعلقات کی شدت سے مخالفت کرتا ہے۔

لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ اپنے اور میرے دشمنوں (کفار و مشرکین) کو دوست نہ بناؤ

ازدواجی تعلقات سے بڑھ کر دوستی اور کیا ہو سکتی ہے۔ اسلامی تعلیمات کا فلسفہ تو بالکل صاف ہے کہ جن راستوں میں ایمان کے دامن کو کفر کی خارزار میں الجھنے کا ذرا بھی اندیشہ ہوتا ہے اُن پر قدم رکھنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا اور نفسیات کے واقف کاروں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ازدواجی محبت کس حد تک انقلابی اثر رکھتی ہے۔

ان تصریحات کی روشنی میں آج کل کے اہل کتاب کے متعلق غور فرمائیے کہ ان میں سے کتنے ہیں جو توریت و انجیل کے سچے پیرو ہیں، کون فرقہ ہے جس کو منھم امۃ مقتصدۃ کا خطاب دیا جا سکتا ہے، کتنے یھدون بالحق وبہ یعدلون کے معیار پر پورے اتر سکتے ہیں اور کتنوں کی آنکھیں معرفت حق کے ساتھ ابل پڑتی ہیں؟ اہل کتاب کے اندر یہ اوصاف اگر آج عنقا ہیں اور یقیناً ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آج نکاح کتابیات کی اباحت کا دروازہ کھولا جائے۔

سیاسی نقطۂ نظر | یہ تو دین و مذہب کا فیصلہ تھا جسے بغیر قیاس وحجت کی آمیزش کے پیش کر دیا گیا لیکن سیاسی اور قومی مصالح بھی کسی طرح اس موالاۃ اور اختلاط کی اجازت نہیں دیتے بالخصوص اس زمانہ کے لیے جبکہ ایمان کی بنیادیں دن بدن کھوکھلی ہوتی جا رہی ہیں اور مسلمانوں کا دین و اسلام حوادث روزگار کے بے پناہ سیلاب میں حباب کی طرح بہتا چلا جا رہا ہے اور مغرب کی مطلق العنان تہذیب کی ہر صدا پر

اسلام کی روح قربان کی جا رہی ہے۔ اس خطرناک فتنہ کو دیکھکر دردمند مسلمانوں کو کبھی بھی خاموش نہ بیٹھنا چاہیے یہ نرے الفاظ نہیں بلکہ حقیقت اور تجربہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہزارہا نوجوان اور ان کے واسطے سے انکے خاندان اسلام سے اور اسلامی تعلیمات سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور یہ غارتگران دین و ایمان نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی سحر آفرینیوں کے ذریعہ مسیحی مشن کو کامیاب بنا رہی ہیں۔

علاوہ ازیں اس کے ذریعہ مغربی تہذیب کی کیسی زبردست تبلیغ اسلامی ماحول میں ہو رہی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس نئے تمدن کو ہر جگہ تفوق اور ہمہ گیری حاصل ہوتی جا رہی ہے اس لئے جو نسلیں ان عورتوں سے پیدا ہونگی وہ بھلا کب اسلامی تہذیب اور اصول معاشرت کو اختیار کر سکتی ہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ مغربی تہذیب اور معاشرت کا ایک ایک عنصر اسلامی تعلیمات کی جگہ لے لے گا اور ملی مفاد اور دینی غیرت تو درکنار قومی احساسات بھی سرد پڑتے جائیں گے۔

پھر مسلمانوں کی اقتصادی کمزوریاں تو کبھی بھی اس کی اجازت نہیں دے سکتیں کہ وہ یوروپین تہذیب کا بار اٹھا سکیں، ہمارا تجربہ خود شاہد ہے کہ کتنے اسی شوق کے پیچھے ننگ و ناموس کھو بیٹھے اور کتنے معاشی حیثیت سے تباہ و برباد ہو گئے۔

علمی و اجتماعی نقطہ نظر اب آخر میں میں علمی اور اجتماعی حیثیت سے اس مسئلہ کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اقوام عالم کے باہمی اختلاط اور نوجوانان عالم کی آزادروی نے اس کو ایک مستقل اور بین الاقوامی مسئلہ بنا دیا ہے۔ جس نے دنیا کے سنجیدہ اور مفکر دماغوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ بالآخر ارباب غور و فکر اپنے مصالح قومی کے لیے مضرت رسان دیکھکر اس کے خلاف سخت احتجاج کر رہے ہیں ان کے خیالات کسی قدر حذف و اضافہ کے ساتھ اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

آج کل ہمارے ترقی پسند اور آزاد خیال نوجوان یورپین عورت کو اس بنا پر ترجیح دے رہے ہیں کہ وہ رفتار زمانہ کا ساتھ دینے کے لیے اپنے اندر کافی صلاحیت رکھتی ہے۔ تہذیب و تمدن کے میدان میں مردوں کے

وش بدوش چل رہی ہے اسے مشرقی عورتوں کی طرح تعلیم و تادیب کی ضرورت نہیں۔ دوسرے ازدواج کا یہ آزاد طریقہ زندگی کو خوش گوار بنانے کے لیے نہایت موزوں اور ضروری ہے، زن و شوہر ایک دوسرے کے عادات و خصائل اور اصول زندگی سے کافی حد تک پہلے ہی واقف ہو چکتے ہیں لہذا ان کے ذاتی تجربات کے بعد جو سلسلۂ ازدواج قائم کیا جائیگا وہ حقیقی محبت اور پرخلوص تعلقات پر مبنی ہوگا۔ اور اختلاف طبائع کے زندگی تلخ کر دینے والے مصائب سے محفوظ رہ کر زندگی میں وہ اطمینان حاصل ہوگا جو اس تعلق کی جان ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر سمجھا جاتا ہے کہ یورپین عورتوں سے شادیاں کرنا گویا حقیقی مسرت اور سعادت حاصل کرنا ہے۔

مگر کیا یہ سعادت اور مسرّت واقعی سعادت اور مسرت ہے یا محض خوش فہمی کا ایک کرشمہ؟

یہ تو ایک مسلّم حقیقت ہے کہ نکاح ایک دائمی تعلق اور زن و شوہر کی باہمی معاشرت کا نام ہے جس کے اندر ایک زبردست اور اہم ترین مصلحت حیات پوشیدہ ہے یعنی اولاد و نسل کی مصلحت کبریٰ جو زوجین کو مجبور کرتی ہے کہ دونوں اپنے مزاجی تباین اور طبیعت کے مختلف رجحانات اور غیر متوازن احساسات کو ایک سطح پر لاکھڑا کریں۔ گویا وہ اصولاً ایک دوسرے کی طرف جھکنے، اور ایک دوسرے کے اطوار و خصائل کو بنظر استحسان دیکھنے یا کم از کم مداہنت سے کام لینے پر مجبور رہتے ہیں، اور یہی چیز سعادت اور کامرانی حیات کی بنیاد ہے لیکن یہ جھکاؤ یا باہمی رعایت محض مصالح اولادہی کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ ماحول اور سوسائٹی کا اخلاقی قانون یا طرز معاشرت ہر شخص کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کے احکام کے دائرہ سے باہر قدم نہ رکھے، انسان اس کے مطابق چل کر طبیعت میں سکون، اور اس کی خلاف ورزی کر کے ایک اضطراب، خوف اور حیا محسوس کرتا ہے لیکن جب ایک شخص اپنے ماحول اور اپنی سوسائٹی سے باہر ہوتا ہے اس وقت اس کا دماغ سوسائٹی کے اخلاقی قیود سے بالکل آزاد ہو جاتا ہے پھر وہ اپنے اغراض و مقاصد کے دوران تحصیل میں ان تمام زنجیروں کو بڑی آسانی کے ساتھ توڑ دیتا ہے جن میں وہ اپنے وطن اور سوسائٹی کے اندر جکڑا ہوا تھا کیوں کہ اس اجنبی ماحول کے اندر اپنی خاص سوسائٹی کے آئین معاشرت کا اسے تصور تک نہیں آتا جس کی مخالفت

کرنے میں اس کو خوف یا حیا دامن گیر ہو۔

یہ نفسیات کا نہایت واضح مسئلہ ہے۔ عورتیں بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ جب ایک اجنبی عورت اپنے ملک کو چھوڑ کر اپنے شوہر کے ہمراہ نئے ملک اور نئی معاشرت میں آتی ہے تو وہاں کی ہر چیز، ہر شکل، ہر طرز، ہر روش اس کی نظروں میں انوکھی اور اوپری معلوم ہوتی ہے جس سے اس کی طبیعت کو اخلاقی یا طبعی کوئی انس نہیں ہوتا۔ دوسری طرف چونکہ وہ اپنے پرانے ماحول اور اس کی تقیدات سے بھی آزاد ہو چکی ہوتی ہے، اس لیے خود اپنی قومی تہذیب کے خلاف عمل کرنے میں بھی اسے کسی بات کا خطرہ نہیں ہوتا اور وہ اپنے ہم قوموں سے جدا ہو کر انتہا درجہ کی بے قید اور بے حیا ہو جاتی ہے ازدواجی زندگی کے تمدنی فرائض کو بھی انجام دینے کی صلاحیت اس میں بہت ہی کم رہ جاتی ہے تا آنکہ اس کے دل پر شوہر کی محبت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے لیکن یہ محبت یقیناً سعادت حیات کی پوری طرح کفیل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کے لیے اس نسلی اور وطنی وفاق کا ہونا ضروری ہے جس کا فلسفہ ابھی ہم اختصار کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ دو اجنبی زوجین کے درمیان ازدواجی تعلق اتنا پختہ، مضبوط اور حیات آفریں نہیں ہو سکتا جتنا دو ہم قوم زن و شوہر کے اندر ہوتا ہے۔

ایسے تعلق کا اولاد پر اثر | تناسلی لحاظ سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں اور جس طرح ایک جنس کے حیوان کے اندر جوہر منویہ کے لحاظ سے بہت سی نوعیں ہوتی ہیں بعینہٖ یہی حال انسان کا ہے، ساتھ ہی یہ بات بھی تجربے کے حدود میں آ چکی ہے کہ ہر نوع دوسری نوع سے بہت سی خصوصیات میں جدا ہوتی ہے مثال کے طور پر ایک تیز گھوڑے کو لیجیے جو چھکڑے کھینچتا ہے۔ اس کے مقابل میں ایک ایسی گھوڑی لیجیے، جو سواری کے لیے مخصوص ہے دونوں کے خصائص بالکل جدا جدا ہوں گے اب اگر ان دونوں سے بچہ پیدا ہو گا تو اس کے اندر ایک خاص نقص اور بودا پن پایا جائے گا کیونکہ اس کا مزاج ماں اور باپ دونوں کے متضاد مزاجوں سے متاثر ہو گا نتیجہ یہ ہو گا کہ نہ تو اس کے اندر چھکڑا کھینچنے والے گھوڑوں جیسی قوت اور مضبوطی ہو گی نہ سواری کے گھوڑوں

جیسی پھرتی اور تیز رفتاری بلکہ دونوں کے بین بین وہ ایک نکمی اور کمزور مخلوق بن کر رہ جائے گا۔

بعینہ یہی حال مختلف نسل و قوم کے انسانوں کا ہے۔ ہر ایک نوع کے مختلف خواص اور مقتضیات ہیں، مصری اقوام کا مزاج الگ ہوتا ہے، چینی کا الگ۔ جب ایک مصری مرد مصری عورت سے رابطۂ زوجیت جوڑتا ہے تو اس کی نسل صحیح معنوں میں مصری خصوصیات کی وارث ہوتی ہے لیکن جب اولاد مخلوط ہوگی تو اس کے اخلاق و عادات کے اندر وہ جوہر صافی نہیں پایا جا سکتا بلکہ اس کے احساسات اور جذبات کی اگر تحلیل کی جائے تو ان کے اندر یقیناً متباین حقائق اور غیر متوافق رجحانات کی آمیزش نظر آئے گی۔

ممکن ہے کہ یہ تباین اور اختلاف فطانت اور ذکاوت کا جوہر اولاد میں پیدا کر دے۔ لیکن وہ اخلاق کی روح کو تو یقیناً بری طرح صدمہ پہونچائے گا۔ اس کی مزید تشریح کی اگر ضرورت ہو تو مثال کے طور پر دو جانوروں کو لیجیے۔ فرض کیجیے کہ ایک کتا ہے جو کسی یورش کے موقع پر راہ فرار اختیار کرتا اور اپنی پناہ ڈھونڈھنے لگتا ہے۔ اس کے مقابل میں ایک مادۂ سگ ہے جو ایسے مواقع پر بھاگنے کے بجائے جان پر کھیل کر چڑھ دوڑتی ہے اب اگر ان دونوں کے اختلاط سے کوئی بچہ پیدا ہو تو یقیناً وہ دو متضاد موثروں کا نتیجہ یعنی بزدلی اور چالاکی کا جامع ہوگا۔ اور در اصل یہ جبن یعنی ضعف خلق ہی اس کی ذکاوت کا سبب ہوگا کیونکہ وہ ہر ایسے مقام پر متردد اور متفکر ہوگا۔ اس کے باپ کی خصوصیات کا جو اثر اس کے مزاج پر ہے وہ فرار ہونے کی رغبت دلائے گا لیکن جہاں تک ماں کے مزاج کو دخل ہے وہ ثبات و استقلال کا داعی ہوگا۔ پس وہ اس وقت عجیب کشمکش یا تذبذب میں مبتلا اور متضاد کیفیات سے دو چار ہوگا۔ یہ تردد اور تذبذب جس کے اندر بزدلی اور کمزوری اخلاق کا پہلو بالکل نمایاں ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آگے بڑھنے کے بجائے موقع کی نزاکت اور اس کے نشیب و فراز پر غور کرنا شروع کرے گا۔ اور یہ غور و فکر کا مادہ یا ذکاوت طبع اسی پدری خون کا اثر ہے جو اس کے خمیر میں موجود ہے۔

ان تمثیلات کو سامنے رکھیے حقیقت بالکل بے نقاب ہو کر نگاہوں کے سامنے آجائے گی کہ اس قسم کی

شادیاں قوم و نسل کے اندر اخلاقی امراض کے مہلک جراثیم کس طرح پیدا کرتی ہیں۔ ضرور ہے کہ ایسی نسل جرائم پیشہ ہو کیونکہ وہ کسی بات پر ہرگز نہیں جم سکتی، وہ ہر کام کی ابتدا شک اور تردد سے کرے گی، عزم و ثبات سے جو نجاح و کامرانی کی اولین شرط ہے اس کا دل بالکل خالی ہوگا، تردد اور تذبذب اس کی فطرت ثانیہ بن جائے گی۔ نہ اس کے اندر باپ کے قومی خصائص اور مزایا موجود ہوں گے نہ ماں کے، گو ان دونوں سے زیادہ ذکی اور فطین ہو لیکن کامرانی حیات انفرادی یا جماعتی ہر حیثیت سے ذکاوت طبع سے زیادہ اخلاق کی محتاج ہے بلکہ صرف اخلاق ہی کی اسے احتیاج ہے۔

تاریخی حقائق سے بڑھ کر قابل اعتبار و اطمینان آفرین کوئی شہادت اور کوئی حجت نہیں، روم و یونان کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ اس کا فلسفۂ زوال اگر دریافت کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ازدواج بالاجانب کی نامحمود رسم نے ان کی آبائی شجاعتوں کا کس طرح ستیاناس کر کے ذلت و پستی کے غار میں انھیں ڈھکیل دیا۔ اور اگر ان تمام سے بھی بڑھ کر واضح ثبوت اور قابل عبرت مثال دیکھنا ہو تو پرتگال کی حالت کو دیکھیے جو اس وقت تمام دول غربیہ میں سب سے زیادہ کمزور اور زوال پذیر ملک ہے اور اس کی وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ یہاں قوم کی رگوں میں کوئی خالص خون موجود نہیں ہے بلکہ زنگیوں اور فرنگیوں کا باہمی اختلاط قومی اور ملکی زندگی پیدا ہی نہیں ہونے دیتا۔ خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اس طرح کے ازدواجی تعلقات دونوں حیثیتوں سے ملک و ملت کے لیئے مضر اور اس کی تباہی کا سامان ہیں ایک طرف تو انسان کو اصلی زندگی اور اس کی مسرتیں نہیں میسر آسکتیں؛ دوسری طرف نسل نہایت ضعیف الاخلاق اور ناکارہ پیدا ہوتی ہے۔

آخری گذارش | انکاح کتابیہ اس ساری بحث کا موضوع ہے، کتابیات یعنی یہود و نصاریٰ کی عورتیں ہم سے مذہب، وطن، نسل، تہذیب، اخلاق و عادات ہر ایک چیز میں جدا ہیں۔ لیکن اسلامی جماعت سے ان کا اختلاط جس حیرت انگیز اور خطرناک طریقہ سے روبہ ترقی ہے، اہل نظر سے پوشیدہ نہیں، ملک و قوم کے لیے یہ

اختلاط جائز ہے یا ناجائز؟ مفید ہے یا مضر؟ اوپر کی سطروں میں انھیں امور سے بحث کی گئی ہے اور اجمالاً اس حقیقت کو الفاظ کے پردہ پر دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کی شریعت، اس کی موجودہ سیاسی حالت اور اس کی اقتصادی کمزوری اس امر کی ہرگز اجازت نہیں دیتی کہ اہل اسلام اس خطرناک فتنہ سے غفلت برتیں، آخر میں علمی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے بھی اس کے مضر اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کیا مشرق، بالخصوص ہندی مسلمانوں کو وقت کے اس نہایت اہم سیاسی اور مذہبی فتنہ کا سدباب نہیں کرنا چاہیے۔ اور کیا ضرورت نہیں ہے کہ سمجھ بوجھ رکھنے والے اور قومی درد رکھنے والے قوم کی اس مہلک آفت پر فوری توجہ کریں۔

استدراک

خوش قسمتی سے یہ مضمون ایسے وقت آیا جب کہ خود ہم کو اس مسئلہ پر اظہار رائے کی ضرورت درپیش تھی۔ ہمارے ایک دوست کا تقاضا تھا کہ "فرنگیات" کی درآمد کا فتنہ بڑھتا جا رہا ہے، اور نکاح کتابیہ کی اجازت کا شرعی مسئلہ اس کے لیے بہانہ بن گیا ہے لہٰذا اس کے متعلق شرعی احکام کی صحیح تشریح ہونی چاہیے انہوں نے اس پر ایک مفصل استفسار بھی لکھ کر بھیج دیا تھا، مگر اب اس کو شائع کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، کیونکہ جن امور کی طرف انہوں نے اپنے استفسار میں توجہ دلائی تھی ان سب کو مولوی صدر الدین صاحب نے اپنے مضمون میں بیان کر دیا ہے۔

اس میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں کہ یہ ایک بڑا فتنہ ہے ہندوستان اور مصر وشام وغیرہ ممالک میں تو اس کا اثر صرف اسی حد تک رہا کہ اسلامی نظام معاشرت میں گھس کر اس نے تہذیب اسلامی کی بیخ کنی شروع کر دی لیکن ٹرکی میں اس کے سیاسی نتائج بھی نہایت خطرناک ثابت ہوئے ہیں، اور اس کی بدولت

ایک عظیم الشان اسلامی سلطنت تباہ ہو چکی ہے۔ اس بنا پر اگر ورہند مسلمانوں کو اس کے سدّباب کی ضرورت کا احساس ہو تو یہ بالکل جائز ہے لیکن ہمارے نزدیک مصالح کے کسی ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ زور دے کر کسی شرعی مسئلہ میں ترمیم کرنا درست نہیں۔ قرآن مجید جس نے نازل کیا ہے وہ حکیم مطلق ہے اور اس کی نظر تمام مصالح و ضروریات پر غایت درجہ توازن و تناسب کے ساتھ پڑتی ہے۔ اس کے احکام کو سمجھنے اور حالات پر ان کو ٹھیک ٹھیک منطبق کرنے کے لیے ضروری ہے کہ حتی الامکان نظر کو زیادہ سے زیادہ وسعت دے کر تمام چھوٹی اور بڑی مصالح کا جائزہ لیا جائے اور ہر ایک کو رعایت کا وہی درجہ دیا جائے جو خود شارع نے دیا ہے۔

قرآن مجید کی جس آیت میں اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّھُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ اِذَآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَلَا مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ (المائدہ: ۱)

آج تمہارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اور ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی ہے تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے اور مومن عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں اور ان لوگوں کی بھی پاک دامن عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی جا چکی ہے (تمہارے لیے حلال ہیں) بشرطیکہ تم ان کو ان کے مہر ادا کر کے قید نکاح میں لاؤ نہ یہ کہ کھلم کھلا بدکاری کرنے والے یا چوری چھپے تعلقات رکھنے والے بنو۔

اختلافات سلف اس آیت کی تفسیر میں سلف کے درمیان بھی بہت کچھ اختلافات ہوئے ہیں اور بعض اختلافات کا منشا وہی شبہات ہیں جو لائق مضمون نگار پیش کر رہے ہیں لیکن جمہور علما نے

ہر زمانہ میں اس کے حکم کو ظاہر الفاظ و عموم اطلاق ہی پر باقی رکھا ہے، اس لئے کہ کسی حکم قرآنی کو ظاہر سے پھیرنے اور عام کو خاص کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے، اور یہاں سرے سے کوئی دلیل ہے ہی نہیں۔ منزل قرآن سے بڑھ کر صاحب حکمت متقن تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ خود اپنے حکم میں کسی استثناء یا تخصیص کی ضرورت سمجھتا تو وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ کے ساتھ کوئی قید ضرور بڑھاتا۔ اس کی شان تشریع سے یہ امر بہت بعید ہے کہ وہ قانونی احکام کے بیان میں اتنی چست زبان بھی استعمال نہ کر سکے جتنی دنیا کے واضعین قانون استعمال کر لیتے ہیں۔ کس طرح ممکن ہے کہ اس کا مقصد تو اہل کتاب کے کسی خاص گروہ کی عورتوں کو حلال کرنا ہو، اور وہ بیان حکم کے لیے الفاظ ایسے منتخب کرے جو تمام اہل کتاب کے لیے عام ہوں اور جن میں استثناء اور تخصیص کے لیے قطعاً کوئی اشارہ تک نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین اور ائمہ سلف نے عموماً اس آیت کو اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کی عام اجازت پر محمول کیا ہے، اور صرف محمول ہی نہیں کیا۔ بلکہ اس کے مطابق عمل بھی کیا ہے، چنانچہ حضرت عثمان بن عفان نے نائلہ بنت فرافصہ کلبیہ سے نکاح کیا جو نصرانیہ تھی، اور طلحہ بن عبید اللہ نے ایک شامی یہودیہ سے نکاح کیا، اور حذیفہ بن الیمان اور کعب بن مالک اور مغیرہ بن شعبہ وغیرہم نے بھی کتابیات سے نکاح کیے یا ان کو نکاح کے پیغام دیے۔

ابن عمر کا مسلک اصحابہ میں سے صرف ایک ابن عمر رضی اللہ عنہ ہیں جنھوں نے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو مطلقاً ناجائز قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "اللہ تعالیٰ نے مشرک عورتوں کو حرام کیا ہے۔ وَلَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکٰتِ حَتّٰی یُؤْمِنَّ (مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں) اور میں نہیں جانتا کہ اس سے بڑھ کر بھی کوئی شرک ہو سکتا ہے کہ عیسیٰ بن مریم یا کسی بندۂ خدا کو خدا قرار دیا جائے۔" اس بنا پر وہ تمام اُن اہل کتاب کی عورتوں کو حرام قرار دیتے ہیں جن کے اعتقاد میں کفر و شرک پایا جاتا ہو۔

اور وَالْمُحْصَنٰتُ کی تفسیر وَالْمُسْلِمَاتُ سے کرتے ہیں۔ یعنی ان کی رائے میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب میں سے جو عورتیں مسلمان ہو جائیں ان کے ساتھ بھی نکاح کرنا تمہارے لیے حلال ہے۔

لیکن اس مسئلہ میں ابن عمر کی رائے درست نہیں ہے جس کے وجوہ مختصراً ہم بیان کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خود ہی اہل کتاب کے وہ تمام عقائد بیان فرمائے ہیں جو صریح شرک پر مبنی ہیں، مثلاً ان کا یہ اعتقاد کہ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اور یہ کہ اِنَّ اللّٰہَ ثَالِثُ ثَلٰثَۃٍ اور قَالَتِ الْیَھُوْدُ عُزَیْرُ نِ ابْنُ اللّٰہِ وَ قَالَتِ النَّصٰرٰی الْمَسِیْحُ ابْنُ اللّٰہِ۔ یہی نہیں بلکہ اس نے لفظ شرک اور کفر کو بھی ان کی طرف منسوب کیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس نے کسی جگہ بھی ان کے لیے "مشرک" کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ تمام قرآن میں جہاں کہیں بھی ان کا ذکر کیا ہے، اہل کتاب یا اس کے ہم معنی دوسرے الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔ قرآن کو اول سے لے کر آخر تک دیکھ جائیے تین گروہ بالکل الگ الگ نظر آئیں گے۔ ایک مشرکین و کفار یعنی وہ لوگ جن کے پاس کوئی آسمانی ہدایت محرف یا غیر محرف موجود ہی نہیں ہے۔ دوسرے اہل کتاب جو اپنی تمام اعتقادی و عملی گمراہیوں کے باوجود کسی نبی اور کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ تیسرے مومنین جن سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو ہیں عام اس سے کہ وہ اسلام میں پیدا ہوئے ہوں یا اہل کتاب کے گروہ . . . . سے اسلام میں آئے ہوں یا مشرکین و کفار کے گروہ سے نکل کر مسلمان ہو گئے ہوں۔ قرآن ان تینوں گروہوں کے درمیان واضح امتیاز برتتا ہے اور کہیں ان کو خلط ملط نہیں کرتا کہ مطلقاً اہل کتاب بول کر مشرک مراد لے، یا مطلقاً مشرک بول کر اہل کتاب مراد لے، یا الذین اوتوا الکتاب بول کر مسلمان مراد لے۔ پس جب اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ وَلَا تَنْکِحُوا الْمُشْرِکَاتِ فرمایا اور دوسری جگہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ، تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ پہلی آیت میں المشرکات سے اہل کتاب کی عورتیں مراد نہیں ہیں بلکہ بت پرستوں اور دوسری غیر کتابی قوموں کی عورتیں مراد ہیں

اگر یہ معنی نہ لیے جائیں تو قرآن کی دو آیتوں میں صریح تعارض لازم آتا ہے جس کو یہ کہکر دفع نہیں کیا جا سکتا کہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے مراد وہ عورتیں ہیں جو یہودیت و نصرانیت چھوڑ کر مسلمان ہو گئی تھیں، یا اُن کتابی فرقوں کی عورتیں ہیں جو شرک و کفر سے پاک تھے، اس لیے کہ۔

اولاً اللہ تعالیٰ نے والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتاب سے پہلے والمحصنٰت من المومنٰت فرمایا ہے اور مومنات سے صرف وہی عورتیں مراد نہیں ہیں جو اسلام میں پیدا ہوئی ہوں بلکہ وہ سب عورتیں بھی مراد ہیں جو اپنے سابق مذہب چھوڑ کر اسلام میں آئی ہوں۔ پس جب مومنات سے نکاح کو عموماً حلال کر دیا تھا اور ان میں وہ عورتیں بھی آپ سے آپ داخل تھیں جو اسلام سے پہلے نصرانی یا یہودی تھیں، تو پھر خاص طور پر والمسلمات من الذین اوتوا الکتاب کے ذکر کی کونسی ضرورت تھی۔ اس طرح تو یہ فقرہ بالکل بے معنی اور عبث ہو جاتا ہے

ثانیاً اس آیت سے پہلے یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے جن کو کتاب دی گئی ہے۔ کیا وہاں بھی اہل کتاب سے مراد وہ مسلمان ہیں جو نصرانیت اور یہودیت چھوڑ کر مسلمان ہوئے ہوں؟ اگر نہیں تو کس بنا پر جائز ہو کہ ایک ہی آیت کے ایک ٹکڑے میں لفظ اہل کتاب کے ایک معنی لیے جائیں اور دوسرے ٹکڑے میں دوسرے معنی؟

ثالثاً، نصاریٰ اور یہود کا کونسا فرقہ ایسا ہے جو شرک یا کفر سے پاک ہو؟ خدا کے بارے میں صحیح اعتقاد ان میں باقی ہی کہاں تھا اور کہاں سے آسکتا تھا؟ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کی اصل تعلیمات سے تو وہ محروم ہو چکے تھے پھر صحت اعتقاد کا راستہ ہی کیسے تھا کہ ان میں کوئی فرقہ راہ راست پر ہوتا؟ پس یہ خیال قطعاً صحیح نہیں کہ والمحصنٰت من الذین اوتوا الکتاب سے یہود یا نصاریٰ کا کوئی صحیح العقیدہ گروہ مراد ہے۔ قرآن کی جن آیات سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان میں کچھ صحیح العقیدہ فرقے بھی تھے، ان کا اشارہ در اصل ایسے اہل کتاب کی طرف ہے جو نیک دل اور سلیم الفطرت ہونے کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی

ہدایت کو قبول کر چکے تھے یا عنقریب قبول کرنے والے تھے۔

رابعاً اور بالفرض اگر یہود و نصاریٰ کا کوئی خاص گروہ ایسا ہو بھی تو اللہ تعالیٰ نے الذین اوتوا الکتاب من قبلکم کے ساتھ کوئی قید ایسی نہیں بڑھائی ہے جس سے یہ مستفاد ہوتا ہو کہ یہ حکم صرف اسی گروہ کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسرے اہل کتاب اس سے خارج ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم خواہ مخواہ اہل کتاب کے اعتقادات کی چھان بین میں لگ جائیں اور اپنے قیاس سے ان کی بعض عورتوں کو حلال اور بعض کو حرام قرار دیں؟

جن لوگوں نے حضرت ابن عمر کے قول کی تائید کی ہے وہ آیت وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ لیکن یہ آیت خاص طور پر ان مردوں اور عورتوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف مسلمان ہو کر ہجرت کر آئے ہوں اور جن کے شوہر یا بیویاں دارالحرب میں بحالت کفر رہ گئی ہوں۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ ان کے دارالاسلام میں آتے ہی جاہلیت کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے اور مہاجر مرد و عورت دونوں نکاح کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں۔ یہ معنی تو شان نزول کے لحاظ سے متحقق ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص نفس الفاظ ہی پر حصر کرے تو ہم کہیں گے کہ ایک جگہ لَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ سے ایک عام حکم بیان کیا گیا تھا۔ پھر دوسری جگہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کہکر یہ بتا دیا گیا کہ کفار میں سے ایک خاص جماعت یعنی اہل کتاب اس لاتمسکوا کی ممانعت عام سے مستثنیٰ ہے۔ اگر آپ یہ نہیں مانتے کہ پہلے حکم عام کو دوسرا حکم خاص کر رہا ہے تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ متضاد باتیں کرتا ہے ایک جگہ ایک چیز کی اجازت دیتا ہے اور دوسری جگہ اسی کی ممانعت کر دیتا ہے۔ معاذ اللہ۔

ابن عباس کا مسلک ابن عمر کے بعد دوسرے صحابی جنہوں نے نکاح کتابیات کی اجازت کو محدود کرنے کی کوشش کی ہے، ابن عباس ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم صرف ذمی عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ نصاریٰ اور

اعتقادات
یہودیں جو لوگ سلطنت اسلامی کی رعایا ہوں صرف انہی کی عورتوں سے نکاح کیا جا سکتا ہے۔ خواہ ان کے
ین کیسا ہی فاسد ہو۔ رہے اہل حرب (یعنی وہ لوگ جو حدود دار الاسلام سے باہر رہتے ہوں) تو ان کی عورتوں
سے نکاح جائز نہیں۔ دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے اس گروہ سے جنگ کا حکم دیا ہے: قَاتِلُوا
الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ
دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (التوبہ)
نیز یہ بھی فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا اور رسول کے دشمن ہوں ان سے محبت رکھنا اہل ایمان کا کام نہیں ہے:
لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (المجادلہ)
دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ازدواجی تعلق کی بنیاد جس چیز پر رکھی ہے وہ مودت اور رحمت کے سوا کچھ
نہیں ہے۔ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَ
رَحْمَةً (الروم: ۲) پس جب نکاح کا تعلق محبت و اخلاص کا مقتضی ہے، اور حربی مشرکین و اہل کتاب
سے محبت رکھنا حرام، اور جنگ کرنا مامور بہ ہے، تو لازم آیا کہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنا جائز نہو۔ یہ
ابن عباس کا استدلال ہے مگر ابن عمر کی طرح ان کی رائے کو بھی جمہور صحابہ و تابعین و ائمہ متفقہین نے
تسلیم نہیں کیا۔ اگرچہ حربیہ سے نکاح کو بالاتفاق سب مکروہ قرار دیتے ہیں، لیکن اس کی حرمت کا کوئی بھی
قائل نہ ہوا کیونکہ والمحصنٰتُ من الذین اوتوا الکتاب کی اجازت حربی اور غیر حربی سب کو شامل
ہے، اور اس میں اللہ تعالیٰ نے کوئی قید نہیں رکھی ہے۔ پس جہاں تک قانونی جواز کا تعلق ہے اس کو
ٹھیک اسی عموم پر باقی رکھنا چاہیئے جو آیت قرآنی میں پایا جاتا ہے۔ رہا قومی مصالح یا شخصی حالات کے
لحاظ سے نکاح کا مناسب نہ ہونا اور اس سے پرہیز کرنا، تو یہ بالکل ایک دوسری چیز ہے۔ ہم جائز کو ناجائز
نہیں کر سکتے البتہ یہ حق ہم کو حاصل ہے کہ جو فعلِ جائز کسی خاص حالت میں یا کسی خاص وجہ سے ہمارے لیے
مناسب نہ ہو اس سے ہم پرہیز کریں، کیونکہ جواز کے معنی امر اور لزوم کے نہیں ہیں۔

جمہور کا مسلک اور ان کے اختلافات | ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما کی رائے کو رد کر دینے کے بعد جو لوگ آیت زیر بحث کے حکم کو عام قرار دیتے ہیں، ان کے درمیان تمام تر اختلاف صرف دو لفظوں کی تفسیر میں ہے، ایک اَلْمُحْصَنَات دوسرے الذین اوتوا الکتاب۔ محصنہ کے معنی ایک گروہ کے نزدیک "پاک دامن عورت" کے ہیں۔ اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ محصنہ وہ عورت ہے جو آزاد ہو، لونڈی نہ ہو۔ پہلے گروہ کے نزدیک اہل کتاب کی صرف ان عورتوں سے نکاح جائز ہے جو عفیفہ ہوں۔ بدکار اور آبرو باختہ اور بے حیا عورتیں اس حکم سے خارج ہیں۔ دوسرے گروہ کی رائے میں کتابیہ لونڈی سے نکاح جائز نہیں خواہ وہ عفیفہ ہی کیوں نہ ہو، اور آزاد کتابیہ سے جائز ہے خواہ وہ بدکار ہی کیوں نہ ہو۔ اہل کتاب کے متعلق اختلاف اس امر میں ہے کہ کون کون سے گروہ ان میں شامل ہیں۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ اہل کتاب صرف وہ یہودی اور نصرانی ہیں جو بنی اسرائیل سے ہوں۔ رہیں دوسری قومیں جنہوں نے یہودیت یا نصرانیت قبول کر لی ہے تو وہ اہل کتاب نہیں ہیں کیونکہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ صرف بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے۔ دوسری قومیں ان کی دعوت کی مخاطب ہی نہ تھیں۔ حنفیہ اور جمہور فقہا کہتے ہیں کہ ہر وہ قوم جو کسی نبی کو مانتی ہو اور کسی کتاب الٰہی پر ایمان رکھتی ہو، اہل کتاب میں شمار کی جائے گی۔ اس میں یہود و نصاریٰ کی بھی کوئی قید نہیں۔ اگر کوئی گروہ صحف ابراہیم کا ماننے والا یا زبور داؤد پر ایمان رکھنے والا ہوتا تو وہ بھی کتابی گروہ ہوتا۔ سلف میں ایک قلیل جماعت اس طرف بھی گئی ہے کہ جن قوموں کے پاس کوئی ایسی کتاب ہے جس پر آسمانی ہونے کا شبہہ کیا جا سکتا ہے وہ بھی اہل کتاب میں سے ہیں مثلاً مجوسی۔ موجودہ زمانہ کے بعض مجتہدین نے اسی خیال کو وسعت دے کر یہ اجتہاد فرمایا ہے کہ ہندو اور چینی اور بودھ مت والے بھی اہل کتاب ہیں اور ان کی عورتوں سے بھی نکاح جائز ہے، کیونکہ بہرحال ان کے ہاں بھی کوئی نہ کوئی نبی آیا ہوگا۔ اور کوئی نہ کوئی کتاب ان کو دی گئی ہوگی۔

اصح المسالک | ان تمام اختلافات میں جو مسلک سب سے زیادہ صحیح ہے وہ یہ ہے کہ اہل کتاب سے مراد

صرف یہود و نصاریٰ ہیں۔ عام اس سے کہ وہ اسرائیلی ہوں یا غیر اسرائیلی۔ قرآن مجید میں اہل کتاب کا لفظ انہی دونوں گروہوں کے لیے آیا ہے اور ایک جگہ تو تصریح کر دی گئی ہے کہ یہی دو گروہ اہل کتاب ہیں وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ اَنْ تَقُوْلُوْا اِنَّمَا اُنْزِلَ الْكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا (الانعام: ۶) ان دو گروہوں کے علاوہ جن دوسری قوموں کے پاس کتابیں بھیجی گئی تھیں انہوں نے چونکہ اپنی کتابوں کو بالکل ضائع کر دیا اور ان کے اعتقاد و عمل میں کوئی چیز بھی تعلیمات نبویہ پر باقی نہیں رہی اس لیے ان پر لفظ اہل کتاب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسیوں کو اہل کتاب قرار نہیں دیا، حالانکہ وہ زردشت کو مانتے ہیں جن پر نبی ہونے کا شبہہ کیا جاتا ہے۔ ہجر کے مجوسیوں سے جب معاملہ پیش آیا تو حضور نے فرمایا کہ سنوا بھم سنة اهل الکتاب (ان کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کرو) یہ نہیں فرمایا کہ وہ اہل کتاب ہیں۔ پھر جو نامۂ مبارک آپ نے مجوس ہجر کو لکھا تھا اس میں صراحت کے ساتھ یہ تحریر فرما دیا تھا کہ۔

فان اسلمتم فلکم مالنا و علیکم ما علینا ومن ابی فعلیه الجزیة غیر اکل ذبائحهم ولا نکاح نساءهم۔	اگر تم اسلام قبول کر وگے تو تمہارے لیے وہی حقوق ہوں گے جو ہمارے ہیں اور تم پر وہی واجبات ہوں گے جو ہم پر ہیں اور جو انکار کریں گے۔ ان پر جزیہ عائد

کیا جائے گا۔ مگر ان کا ذبیحہ نہ کھایا جائے گا نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائیگا۔

اس تصریح کے بعد یہ شبہہ کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ غیر یہود و نصاریٰ کو بھی اکل ذبائح اور نکاح محصنات کی اغراض کے لیے اہل کتاب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

رہی اسرائیلیت کی قید، جو امام شافعی نے لگائی ہے تو وہ بھی درست نہیں۔ بلا شبہہ دعوت موسوی و عیسوی کے مخاطب صرف بنی اسرائیل تھے، مگر جن غیر اسرائیلی قوموں نے نصرانیت کو قبول

کیا انھیں بھی تو خدا اور رسول نے اہل کتاب ہی میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نامۂ مبارک قیصر روم کے نام لکھا تھا اس میں یہ آیت نقل فرمائی تھی کہ یَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ۔

پھر جن لوگوں نے محصنات کا ترجمہ عفیفہ یا حرہ کیا ہے اور عفت یا حریت کو نکاح کتابیہ کے لیے شرط قرار دیا ہے ان کا مسلک بھی درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ احصان کے مفہوم میں عفت و شرافت دونوں داخل ہیں اور محصنہ سے مراد ایسی ہی عورت ہے جو پاک دامن بھی ہو اور شریف و معزز بھی لیکن شارع کا مقصود ان دونوں چیزوں کو نکاح کے لیے شرط قرار دینا نہیں ہے بلکہ محض فضیلت و اولویت کا اظہار مقصود ہے اور شارع دراصل یہ بتانا چاہتا ہے کہ تم نکاح کرنے کو تو ہر مومن اور کتابی عورت سے کر سکتے ہو مگر اولیٰ اور افضل یہ ہے کہ وہ عورت محصنہ یعنی شریف اور پاک دامن ہو۔ قرآنی احکام میں اس قسم کی قیود بکثرت لگائی گئی ہیں جو ثبوت حکم کے لیے شرط کی حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ کسی فعل جائز کے افضل پہلو یا کسی فعل ناجائز کے ارذل پہلو کو ظاہر کرنے کے لیے بطور ایک قید زائد کے رکھدی گئی ہیں تاکہ اہل ایمان افضل کے اختیار اور ارذل سے اجتناب کا اہتمام کریں۔ بعینہٖ یہی مسلک ہے جو اس باب میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اختیار فرمایا ہے۔ حضرت حذیفہ بن الیمان نے ایک یہودیہ سے نکاح کیا۔ حضرت عمر کو اطلاع پہنچی تو آپ نے لکھا کہ اسے چھوڑ دو۔ انہوں نے دریافت کیا کہ یہ حکم کس بنا پر ہے؟ کیا کتابیہ سے نکاح کرنا حرام ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ حرام نہیں ہے مگر مجھے خوف ہے کہ کہیں تم لوگ اہل کتاب کی آبرو باختہ عورتوں میں نہ پھنس جاؤ۔

پس تمام مسالک میں جو مسلک ہمارے نزدیک اصح ہے وہ یہ ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنے کے شرعی جواز کو عام قرار دیا جائے خواہ وہ حربیہ ہوں یا ذمیہ، عفیفہ ہوں یا نہ ہوں، لونڈیاں ہوں یا آزاد۔

مصالح و حکم | یہاں تک تو صرف قانون شریعت کا بیان تھا۔ اب ہم اس کے حکمی پہلو کی طرف توجہ کرتے ہیں

نکاح کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر | شریعت اسلامیہ میں نکاح کی حیثیت محض ایک عمرانی معاہدہ (Social Contract) ہی کی نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگ آج کل تعبیر کر رہے ہیں، بلکہ اس میں ایک مذہبی تقدس کی شان بھی ہے۔ یہ تقدس ہندوؤں اور عیسائیوں کے نکاح کی طرح (Sacrament) کی حد تک تو نہیں پہونچتا، مگر عبادت کی حد تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ شارع اس سے نہ صرف تمدنی و عمرانی فوائد حاصل کرنا چاہتا ہے بلکہ دینی و روحانی فوائد بھی چاہتا ہے۔ اس سے اخلاق کی اصلاح مقصود ہے۔ سوسائٹی کی پاکیزگی مقصود ہے۔ ایک خالص اسلامی نظام معاشرت کا بقا و دوام اور نشو و ارتقا مقصود ہے۔ دنیا میں خدا کا نام لینے والی اور کلمۃ اللہ کو بلند کرنے والی نسلیں پیدا کرنا مقصود ہے اور ان مقاصد میں مددگار ہونے ہی کی وجہ سے اس کو عبادات کے قریب جگہ دی گئی ہے بعض فقہائے اسلام نے تو یہاں تک کہدیا کہ بعض حیثیات سے نکاح کو جہاد پر بھی فضیلت ہے کیونکہ نکاح اور جہاد دونوں وجودِ مسلم اور وجودِ اسلام کے اسباب ہیں، مگر جو کچھ افرادِ مسلمین کی مناکحت سے حاصل ہوتا ہے وہ اس سے بدرجہا زیادہ ہے جو جہاد سے حاصل ہوتا ہے جہاد میں تو زیادہ تر امکان اس کا ہے کہ کفار قتل ہوں گے یا ذمی بن کر حالت کفر ہی میں رہیں گے بخلاف اس کے مناکحاتِ اہل اسلام کا خاص نتیجہ یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کی ایک نسل کے اخلاق محفوظ ہوں گے اور دوسری نسل متبعین اسلام کی وجود میں آئے گی۔

اس باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ان احادیث پر ایک نگاہ ڈالنی چاہیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کے متعلق مروی ہیں۔ ابو یعلیٰ نے اپنی مُسند میں نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ عکاف بن ودّاعۃ الھلالی سے پوچھا کیا تو بیوی رکھتا ہے؟ انہوں نے کہا، نہیں۔ آپ نے پوچھا لونڈی بھی نہیں۔ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا تو صحیح الجسم اور خوشحال ہے؟ انہوں نے عرض کیا، ہاں۔ آپ نے فرمایا تب تو تو شیطان کے بھائیوں میں سے ہے یا رھبان نصاریٰ میں سے ہے۔ اگر تو ہماری جماعت میں شامل ہونا چاہتا ہے تو وہی کر جو ہم کرتے ہیں۔ اور ہمارے طریقوں

میں سے ایک نکاح بھی ہے۔ تم میں بدترین لوگ وہ ہیں جو مجرد رہتے ہیں اور تمہارے مرنے والوں میں بدترین وہ ہیں جو مجرد مرتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ تناکحوا تناسلوا تکثروا فانی مکاثر بکم الامم یوم القیمۃ نکاح کرو نسلیں بڑھاؤ، اپنی تعداد میں اضافہ کرو کیونکہ میں قیامت کے روز تمام امتوں کے مقابلہ میں تمہاری تعداد زیادہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

ایک موقع پر فرمایا اربع من اعطیھن فقد اعطی خیر الدنیا والآخرۃ قلباً شاکراً ولساناً ذاکراً وبدناً علی البلاء صابراً وزوجۃ لا تبغیہ حوبا فی نفسھا ومالہ۔ (رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط) چار چیزیں ہیں کہ جس کو وہ دی گئیں اسے دنیا اور آخرت کی ساری بھلائی دے دی گئی۔ ایک وہ دل کہ خدا جو کچھ دے اس پر وہ شکر ادا کرے۔ دوسرے وہ زبان جو خدا کا ذکر کرنے والی ہو۔ تیسرے وہ بدن جو مصیبتوں کے مقابلہ میں ٹھیرنے کی قوت رکھتا ہو۔ چوتھے وہ بیوی جو شوہر کے مال اور اپنی عصمت میں کسی خیانت کی طرف مائل نہ ہو۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا من اراد ان یلقی اللہ طاھراً مطھراً فلیتزوج الحرائر (ابن ماجہ) جو کوئی اللہ سے پاک صاف ملنا چاہتا ہو اسے شریف عورتوں سے شادی کرنا چاہیے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے لا تتزوجوا النساء لحسنھن فعسی حسنھن ان یردیھن ولا تتزوجوھن لاموالھن فعسی اموالھن ان تطغیھن ولکن تزوجوھن علی الدین فلامۃ خرقاء سوداء ذات دین افضل (ابن ماجہ) عورتوں سے ان کے حسن کی خاطر شادیاں نہ کرو۔ ممکن ہے کہ ان کا حسن ان کو بگاڑ دے۔ اور تم ان کے مال و دولت کی خاطر بھی شادیاں نہ کرو۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے اموال ان کو سرکش بنا دیں۔ تم کو ان میں جو چیز دیکھنی چاہیے وہ دین ہے۔ اگر ایک سیاہ رو اور نادان لونڈی بھی دیندار ہو تو وہ دوسری عورتوں سے افضل ہے۔

اسی قسم کی بہت سی احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں نکاح کی اہمیت صرف ایک تمدنی ضرورت کو پورا کرنے ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ سب سے بڑا مقصد تحصین نفس اور طہارت اخلاق، اور تہذیب اسلامی کا فروغ، اور خالص مسلمان نسلیں پیدا کرنا ہے اور ان اغراض کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ مسلمان نکاح کریں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے نکاح ایسی عورتوں سے ہوں جو مسلمان ہوں، دین دار ہوں، شریف اور باعصمت ہوں، کیونکہ ایک صالح اسلامی سوسائٹی ایسے ہی مردوں اور عورتوں کے ازدواج سے وجود میں آسکتی ہے، اور ایک صالح مسلمان نسل ایسی ہی ماؤں کے پیٹ سے پیدا ہو سکتی ہے۔

مخلوط شادیوں کی مضرت دینی نقطۂ نظر سے ہٹ کر خالص عمرانی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مخلوط شادیوں (Mixed marriages) سے بڑھ کر کوئی چیز نظام معاشرت اور حیات عائلی کو فاسد کرنے والی نہیں ہو سکتی۔ وہ ایسے زوجین جن کے خیالات میں بعد المشرقین ہو اور جنہوں نے دو بالکل مختلف ماحولوں میں مختلف روایات اور مختلف معاشرتوں کے زیر اثر پرورش پائی ہو۔ اپنے باہمی اختلاط سے نہ تو خود اپنی زندگی میں سکون و راحت حاصل کر سکتے ہیں، نہ اپنے گھر کو کسی نظام معاشرت کا صالح رکن بنا سکتے ہیں۔ اور نہ کوئی ایسی نسل پیدا کر سکتے ہیں جو کسی نظام تمدن میں ٹھیک ٹھیک نصب ہو سکتی ہو۔ یہ ممکن ہے کہ ان کے درمیان محبت ہو اور آخر تک رہے، مگر ان کی محبت اور رفاقت زیادہ سے زیادہ صرف انہی کی ذات کیلئے لطف و لذت کی موجب ہو سکتی ہے اس سے بڑھ کر اسکا کوئی تمدنی فائدہ نہیں ہے اختلاف مذہب و اختلاف قومیت تو خیر بڑی چیز ہے حیات عائلی کی کامیابی اور نظام تمدن کی بہتری کے لیے تو ایسی شادیاں بھی مفید نہیں ہوتیں جن کے دونوں فریق ایک ہی سوسائٹی کے دو مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہوں۔ اختلاف کا لازمی نتیجہ فساد ہے، اور صلاح کے لیے ضروری ہے کہ زوجین کے درمیان زیادہ سے زیادہ امور میں اتحاد ہو۔ صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ان کا دین ایک ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان کا طرز معاشرت ایک ہو، ان کے خیالات اور اصول حیات میں یکسانی ہو، ان کے

معاشی اور معاشرتی مرتبہ میں ہمواری ہو، اور انہوں نے ایسی خاندانی روایات کے زیر اثر تربیت پائی ہو جو ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوں۔ یہی چیز ہے جس کو اصطلاح شریعت میں "کفاءت" کہتے ہیں شارع نے مناکحت میں کفو کو جو اہمیت دی ہے وہ اسی لیے ہے کہ زوجین میں زیادہ سے زیادہ مماثلت ہو کیونکہ مماثلت صرف زوجین ہی کے لیے مودت و رحمت کی موجب نہیں ہے بلکہ پوری سوسائٹی کے لیے مفید ہے اور آئندہ نسلوں کی بہتری بھی اسی پر موقوف ہے۔ جن زوجین میں مماثلت نہیں ہوتی ان کی مواصلت محض ایک جسمانی مواصلت ہے جو تمدن و تہذیب کے نقطۂ نظر سے قطعی بانجھ یا قریب قریب بانجھ ہوتی ہے۔

اختلاف مذہب کے نقصانات

عدم کفاءت کے نقصانات تو صرف اسی قدر ہیں کہ اس سے زوجین میں مودت و رحمت کم اور نتیجہ خیز اشتراک عمل کم تر ہوتا ہے۔ مگر اختلاف مذہب و قومیت کے نقصانات اس سے بدرجہا زیادہ ہیں۔ اس میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ ایک غیر مسلم ماں کی آغوش میں جو اولاد تربیت پاکر اٹھیگی وہ دین و اخلاق کے اعتبار سے اسلامی سوسائٹی کے کسی کام کی نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ وہ ایک مسلمان گھر میں غیر اسلامی طریقے رائج کرے گی اور جن جن گھروں سے اس کے روابط ہوں گے وہ سب کم و بیش اس عضو فاسد کے شر سے متاثر ہوں گے۔ پھر خود شوہر بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہے گا۔ اگر وہ اس کی محبت میں زیادہ گرفتار رہا تو ممکن ہے کہ اپنے دین و ایمان کو بھی ہاتھ سے کھو بیٹھے، اور اگر یہ فساد اس حد تک نہ بھی پہونچا تو اس کا کم سے کم یہ اثر ضرور ہوگا کہ وہ اپنے گھر میں اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب کے بہت سے ارکان کی بربادی اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھیگا اور اس کو گوارا کرے گا۔ سیاسی حیثیت سے بھی اس قسم کی شادیاں خالی از مضرت نہیں۔ سازش اور جاسوسی اور سلطنت اسلامی کی بیخ کنی کے لیے مسلمان گھر کی کافر ملکہ بہت آسانی کے ساتھ استعمال کیجا سکتی ہے، اور اگر وہ زیادہ ہوشیار ہو تو اپنے شوہر کو بھی ان اغراض کے لیے آلۂ کار بنا سکتی ہے۔ یہ سب وہ

مضمر ہیں جو پہلے بھی ظاہر ہو چکی ہیں اور آج بھی ظاہر ہو رہی ہیں۔ ہندستان میں ہمارے نظام معاشرت کو مشرکانہ رسوم اور جاہلانہ عادتوں سے کس نے آلودہ کیا؟ انہی عورتوں نے جو مذہب شرک پر قائم رہکر یا برائے نام مسلمان ہو کر مسلمان خاندانوں میں داخل ہوئیں۔ مسلمانوں کی نسلوں کو دین و اخلاق کے اعتبار سے کس نے تباہ کیا؟ انہی ماؤں نے جن کے سینوں سے مسلمانوں کے بچے شرک و جاہلیت کا دودھ پی پی کر بڑے ہوئے۔ اسلامی حکومتوں کو کس چیز نے غارت کیا؟ زیادہ تر ان کافر عورتوں کی محبت نے جو مسلمان امراء کے دلوں پر متصرف ہو گئی تھیں۔ آج اسلامی نظام معاشرت کی بنیادوں کو کونسی چیز کھوکھلا کر رہی ہے؟ ایک بڑی حد تک ان مغربی عورتوں کی حکومت جو ہماری سوسائٹی کے خوشحال اور با اثر طبقوں پر مسلط ہو گئی ہیں۔

اسلامی قانون ازدواج کی شان اعتدال

جب حال یہ ہے تو ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ غیر مسلم عورتوں سے نکاح کرنا بالکلیہ ممنوع ہونا چاہیے تھا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ شارع نے اس چیز کو جائز رکھا؟ اس کا صحیح جواب معلوم کرنے کے لیے ہم کو اس مسئلہ کے دوسرے پہلو پر نگاہ ڈالنی چاہیے کہ یہی وہ مقام ہے۔ جہاں شارع کا کمال حکمت اور اس کے طریق تشریع کا انتہائی اعتدال و توازن نظر آتا ہے۔

انسان جب کوئی قانون بناتا ہے تو عموماً وہ کسی ایک پہلو کی طرف اس قدر جھک جاتا ہے کہ دوسرے پہلو اس کی رعایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کبھی وہ اجتماعی مصالح پر زیادہ زور دیتا ہے اور شخصی مصالح نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور کبھی شخصی مصالح کی اتنی رعایت کرتا ہے کہ اجتماعی مصالح باطل ہو جاتے ہیں۔ مگر شارع اسلام کی حکیمانہ شان ایسی ہے کہ وہ ہر مصلحت پر نظر رکھتا ہے اور ہر ایک کی اتنی ہی رعایت کرتا ہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، اجتماعی مصالح اور ایک بڑی حد تک شخصی مصالح کا اقتضاء یہ تھا کہ مسلمانوں کی شادیاں مسلمان عورتوں ہی سے ہوں اور پھر ان میں بھی مماثلت اور اتحاد کو ملحوظ رکھا جائے، چنانچہ اس کے لیے کفاءت کا ضابطہ مقرر کیا گیا:

تخیّروا لنطفکم وانکحوا الاکفاء۔ اپنے نطفوں کے لیے اچھی قرارگاہیں تلاش کرو اور اپنے

(روی ذٰلک من حدیث عائشہ وانس وعمرؓ من طرق عدیدہ) کفو والوں میں شادیاں کرو۔

اور صاف طور پر بتادیا گیا کہ کفاءت میں سب سے پہلی اور سب سے اہم چیز دین ہے:۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (التوبۃ)

مومنین اور مومنات ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ (اس لیے کہ) وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور خدا ورسول کی اطاعت کرتے ہیں۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم)

اے اہل ایمان اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ (النساء:۴)

اور تم میں سے جو کوئی پاک دامن مومن عورتوں سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔ وہ ان مومن لڑکیوں میں سے اپنے لیے جوڑا منتخب کرے جو تمہاری مملوک ہیں۔ اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے اور تم سب ایک دوسرے کے ہو۔

تزوجوهن على الدين فلامة خرقاء سوداء ذات دين افضل (الحديث)

تم ان سے دین کی بنا پر شادیاں کرو کیونکہ ایک بیوقوف سیاہ لونڈی بھی جو دین دار ہو دوسری عورتوں سے افضل ہے۔

دوسری طرف بعض شخصی مصالح اس کی بھی مقتضی تھیں کہ غیر قوموں میں نکاح کرنے کا دروازہ قطعی طور پر بند نہ کر دیا جاتا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کسی غیر مسلم عورت کے عشق میں مبتلا ہوجائے اور حصول مقصود کا

دروازہ بالکل بند پاکر حرام کی طرف جھک پڑے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کسی ایسی جگہ رہتا ہو جہاں مسلمان عورت بہم نہ پہنچ سکتی ہو، اور مجرد رہنے کی وجہ سے اس کے اخلاق بگڑنے اور اس کی خانگی زندگی خراب ہونے کا اندیشہ ہو۔ ایسے مخصوص حالات کے لیے کسی حد تک رخصت کا دروازہ کھول دینا ضروری تھا۔ چنانچہ شارع نے یہ دروازہ کھولا، مگر اس فتح باب میں شخصی مصالح کی رعایت کے ساتھ یہ بات ملحوظ رکھی کہ اجتماعی مصالح کو کم سے کم نقصان پہنچے۔

مسلمہ اور غیر مسلم کے نکاح کی حرمت سب سے پہلے تو یہ بات طے کر دی گئی کہ غیر مسلموں کے ساتھ شادی کرنے کی رخصت صرف مردوں کو دی جا سکتی ہے، عورتوں کے لیے یہ دروازہ قطعاً مسدود ہے۔

لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۔ نہ مسلمان عورتیں کافر مردوں کے لیے حلال ہیں اور نہ کافر مرد مسلمان عورتوں کے لیے حلال۔ (الممتحنہ ۲۰)

یہ اس لیے کہ عورت کی فطرت ایک انفعالی فطرت ہے۔ اس میں ڈھال لینے سے زیادہ ڈھل جانے کی صلاحیت ہوتی ہے، وہ مرد کے اثرات اپنے ماحول کے اثرات کو زیادہ شدت کے ساتھ قبول کرتی ہے۔ اور عائلی زندگی میں شوہر سے عموماً مغلوب ہی ہو کر رہتی ہے۔ ایک غیر مسلم مرد سے اس کی شادی ہونے میں کم از کم ۹۰ فی صدی خطرہ اسی بات کا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اسلام اور اس کی تہذیب سے کٹ جائے گی، اور یہ خطرہ تو سو فی صدی ہے کہ اس کے پیٹ سے جو اولاد پیدا ہو گی وہ ملت کفر پر رہے گی پس تمام مصالح و حکم اس بات کے مقتضی تھے کہ مسلمان عورتوں کے لیے غیر مسلموں کی زوجیت قطعی طور پر حرام کر دی جائے۔ اور رخصت کا دروازہ اگر کھولا بھی جائے تو وہ صرف مردوں کے لیے ہو۔

مسلم اور غیر مسلمہ کے نکاح کے قیود پھر مردوں کے لیے بھی یہ رخصت عام نہیں ہے۔ غیر مسلموں کو ازدواجی اغراض کے لیے دو طبقوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک وہ طبقہ جو اسلام اور اس کی تہذیب سے بُعدِ بعید رکھتا ہے، جس کے عقائد اور اصول حیات اور قوانین اخلاق و معاشرت کسی جہت میں بھی مسلمانوں سے نہیں ملتے

دوسرا وہ طبقہ جو تمام غیر مسلموں میں اسلام سے اقرب ہے، نبوت اور وحی کو کسی نہ کسی حد تک مانتا ہے، خدا اور یوم آخر کے اعتقاد میں بھی کسی حد تک اسلام سے قریب ہے، اصول اخلاق اور قوانین معاشرت میں بھی بہت سی ایسی چیزیں ابھی تک اس کے پاس محفوظ ہیں جو منبع نبوت سے نکلی ہوئی ہیں۔ ان دونوں طبقوں میں سے پہلے طبقہ سے ساتھ تو شادی بیاہ کرنا مسلمانوں کے لیے قطعی ممنوع کر دیا گیا۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ (البقرہ ۲۷)

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومن لونڈی ایک مشرکہ سے بہتر ہے خواہ وہ تم کو کتنی ہی پسند ہو اور تم اپنی عورتوں کی شادیاں بھی مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومن غلام ایک مشرک سے بہتر ہے خواہ وہ تمہیں کتنا ہی پسند ہو۔ وہ آگ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اور خدا اپنے اذن سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔

نکاح کتابیہ کی اجازت رہا دوسرا طبقہ تو اس کی عورتوں سے شادیاں کرنے کی اجازت دے دی گئی، مگر اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ یہ محض ایک رخصت ہے اور اس لیے عطا کی گئی ہے کہ تم حرام کاری میں مبتلا نہ ہو۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ (المائدہ : ۱)

اور حلال ہیں تمہارے لیے ان لوگوں کی عورتیں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی ہے، بشرطیکہ تم ان کے مہر ادا کر کے قید نکاح میں لاؤ اور علانیہ یا چوری چھپے زنا کاری نہ کرو۔

نکاح کتابیہ کی کراہیت | جو لوگ شریعت اسلام کی روح سے اچھی طرح واقف تھے انہوں نے اس اجازت کو ہمیشہ رخصت ہی کے قبیل سے سمجھا اور اس کو پسند نہ کیا کہ مسلمانوں میں کتابیات سے شادی کرنے کا عام رواج ہو۔ شریعت کے سب سے بڑے راز داں اپنے عہد میں حضرت عمر تھے۔ انہوں نے حضرت حذیفہ کو جو کچھ لکھا تھا وہ شریعت کی اسپرٹ پر خوب روشنی ڈالتا ہے۔ زمانہ اسلام کے غلبہ کا تھا مسلمان ارض شام میں فاتح اور حکمراں کی حیثیت سے تھے۔ معاملہ ایک ایسے جلیل القدر مسلمان کا تھا جس نے براہ راست شمع نبوت سے نور ایمان کا اکتساب کیا تھا۔ اسلامی اخلاق اور اسلامی تہذیب میں اس سے بڑھ کر اور کون پختہ ہو سکتا تھا۔ مگر باوجود اس کے حضرت عمر نے حضرت حذیفہ کو ایک کتابیہ کے ساتھ ازدواجی تعلق رکھنے سے منع کیا۔ پھر یہ نہیں فرمایا کہ کتابیہ سے شادی کرنا حرام ہے۔ بلکہ یہ فرمایا کہ اس سے مسلمان گھروں میں اہل کتاب کی بداخلاق عورتوں کے گھس آنے کا اندیشہ ہے، لہٰذا اس اجازت سے فائدہ نہ اٹھانا ہی بہتر ہے۔

غور کیجیے کہ جب غلبہ کی حالت میں نکاح کتابیہ کے متعلق اسلام کا یہ طرز عمل ہے تو ایسی حالت میں کیا طرز عمل ہونا چاہیے جبکہ ایک مسلمان کفار سے مغلوب ہو اور ان کی سوسائٹی میں گھرا ہوا ہو۔ اس وقت تو نکاح کتابیہ کی کراہت اور زیادہ بڑھ جانی چاہیے، کیونکہ دارالکفر میں اس کی مضرتیں کئی گنی زیادہ ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ اسلام نے عموماً نکاح کتابیہ کو مکروہ، اور خصوصاً دارالکفر میں نہایت مکروہ قرار دیا ہے۔ شمس الائمہ سرخسیؒ اپنی کتاب المبسوط میں لکھتے ہیں:-

یجوز للمسلم ان یتزوج کتابیة فی دار الحرب	مسلمان کے لیے دارالحرب میں کتابیہ سے شادی کرنا جائز
ولکنہ یکرہ لانہ اذا تزوجہا ثمة	تو ہے مگر مکروہ ہے کیونکہ اگر وہ وہاں شادی کریگا تو
ربما یختار المقام فیہم۔۔ واذا ولدت	ممکن ہے کہ کفار ہی کے ملک میں رہ پڑے..... اور
تخلق الولد باخلاق الکفار وفیہ بعض	جب کتابیہ کے پیٹ سے اولاد پیدا ہو تو وہ کفار کے اخلاق
الفتنة فیکرہ لہذا..........	پر اٹھے۔ اس میں اور بھی فتنے ہیں اس لیے یہ مکروہ ہے

علی رضی اللہ عنہ عن مناکحۃ اهل الحرب من اهل الکتٰب فکرہ ذالك (ج ۵ ص ۵)

....حضرت علی رضی اللہ سے حربی عورتوں کے ساتھ نکاح کے بارہ میں پوچھا گیا تو آپ نے اس کو مکروہ فرمایا

امام ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

"ذمیہ اور حربیہ دونوں سے نکاح جائز ہے بشرطیکہ نکاح کرنیوالا ایسی جگہ نہ ہو جہاں اس کی اولاد کے کفر پر مجبور ہونے کا خوف ہو۔ (جزو سادس ۔ ص ۶۱)

ہدایہ میں ہے :-

ویجوز تزویج الکتابیات والاولیٰ ان لایفعل ولا یاکل ذبیحتھم الا للضرورۃ وتکرہ الکتابیۃ الحربیۃ اجماعا لانفتاح باب الفتنۃ من امکان التعلق المستدعی للمقام معھا فی دار الحرب وتعریض الولد علی التخلق باخلاق اھل الکفر۔ (کتاب النکاح)۔

کتابیات سے نکاح کرنا جائز ہے مگر بہتر یہ ہے کہ نہ کیا جائے اور نہ ان کا ذبیحہ کھایا جائے الّا یہ کہ ضرورت آپڑے۔ اور حربی کتابیہ سے نکاح کرنا بالاجماع مکروہ ہے۔ کیونکہ اس سے فتنہ کا دروازہ کھلتا ہے۔ مثلاً یہ کہ عورت سے ایسا گہرا تعلق ہو جائے کہ مسلمان شوہر اسی کے ساتھ کافروں کے ملک میں رہ پڑے۔ اور یہ کہ اس کی اولاد اہل کفر کے اخلاق سے متخلق ہو جائے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نکاح کتابیہ کو ناجائز اور باطل ٹھیرانا درست نہیں ہے۔ البتہ قانون اسلامی کی اسپرٹ اور ائمۂ اسلام کے اجماع سے اس کا مکروہ ہونا اور خصوصاً دار الکفر میں اور غلبۂ کفار کی حالت میں نہایت درجہ مکروہ و مبغوض ہونا ثابت ہے۔ اس کے ساتھ حضرت عمر کے فعل سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ نہ صرف نکاح کتابیہ کے معاملہ میں بلکہ شریعت کی تمام رخصتوں کے معاملہ میں جن سے ناجائز فائدہ اٹھانیکا میلان پایا جاتا ہو، مسلمانوں کے اولی الامر کو امتناعی احکام جاری کرنے کا حق ہے اور اس قسم کے امتناعی احکام جائز کو ناجائز اور حلال کو حرام کیے بغیر نافذ کیے جاسکتے ہیں مگر ایسے احکام جاری کرنے والوں میں اتنا تفقہ ہونا چاہیے کہ وہ قانون شریعت کی شان اعتدال کو ضائع نہ کریں

شخصیت پرستی

از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز

اسلام کا نصب العین یہ تھا کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان براہ راست تعلق پیدا کر دے۔ ایسا تعلق کہ عبد و معبود کے درمیان کوئی دوسرا واسطہ نہ رہے۔ ان کے درمیان کوئی دوسری قوت حائل نہ ہو۔ نبی اکرم تشریف لائے اور اپنی عدیم النظیر تعلیم اور فقید المثال عمل سے بتا دیا کہ اس بلند ترین تخیل اس زرین نصب العین کو کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے چنانچہ حضور کا مشن ان شاندار الفاظ میں بتایا گیا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۔ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ۔ ۴۱:۶

کہو کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ پس اسی کی طرف سیدھی راہ اختیار کرو۔ اس سے مغفرت مانگو اور مشرکین کے لیے بڑی ہی خرابی ہے۔

اور اسی کی تفسیر تھی جو پیکر اسلام جناب عمرؓ نے وادی ضجنان میں گذرتے وقت فرمایا۔ اللہ اکبر یہ وہ وادی ہے جس میں ابن خطاب اونٹ چرایا کرتا تھا اور باپ کی سخت گیری برداشت کیا کرتا تھا اور آج اس رب العزت کا اتنا فضل ہے کہ عمر اور اس کے خدا کے درمیان کوئی دوسری طاقت حائل نہیں۔ اس سے مراد محض جسمانی اور روحانی طاقت ہی نہ تھی بلکہ ہر وہ طاقت جو انسان کے قلب و دماغ پر مستولی ہو کر اس کے اور اس کے خدا کے درمیان حاجب و دربان بن جاتی ہے۔

محبوب
لیکن ہر دقیق نظریہ کی طرح یہ نظریہ تھا بڑا لطیف۔ اور ہر حقیقت عظمیٰ کے مانند یہ حقیقت تھی بڑی غیر

محسوسات کا خوگر انسان، کہ جس کے سجدہ ہائے جبین نیاز بسیط سے بسیط حقیقت مجردہ کو بھی لباس مجاز میں دیکھنے کے لیے رقصاں وجنباں رہتے ہیں، اس غیر محسوس تعلق سے زیادہ عرصہ تک کیف اندوز نہ ہو سکا اور اس نے وہ تمام پردے، ایک ایک کرکے پھر سے گرا لیے جو اس کے اور اس کے خدا کے درمیان حائل تھے اور جنہیں نبی عربی نے ایک ایک کرکے اٹھا دیا تھا۔ قرآن کریم نے بڑی شرح وبسط سے ان تمام مقامات کو ایک ایک کرکے گنا دیا تھا، جہاں سے یہ پردے قلب ودماغ اور سمع وبصر پر گرا کرتے ہیں۔ لہٰذا جب تک قرآن آنکھوں کے سامنے رہا کسی کی مجال نہ ہوئی کہ ان پردوں کو پھر سامنے لا سکے۔ کہ چراغ کا روشن ہونا ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ اندھیرا وہاں نہ آسکے۔ لیکن جب قرآن مہجور ہو گیا جب بنی اسرائیل کی طرح اس نور مبین کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ تو وہی کچھ ہوا جو ہوتا چلا آتا تھا۔ کہ فطرت کے قوانین اٹل اور اس کا دستور غیر متبدل ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ آیئے ان مختلف پردوں۔ اور ان کے حسین وجمیل نقش ونگار کی سیر کریں جو عقیدت وارادت کے رنگوں سے مزین اور اطاعت ومتابعت کے جواہر سے مرصع ہیں۔

رسول پرستی خدا کے بعد ماننے والوں کے نزدیک ہمیشہ رسول کی ہستی اشرف ترین مخلوق ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر انسانوں میں سے کسی کو خدا کی جگہ دیے جانے کا احتمال ہو سکتا ہے تو سب سے پہلے وہ رسول ہی کی ہستی ہو سکتی ہے۔ امم سابقہ کی روش اس باب میں جو کچھ رہی ہے اس پر قرآن تفصیلی روشنی ڈالتا ہے، وہ فطرت انسانی کے اس کمزور پہلو سے واقف تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کس طرح حضرات انبیاء کرامؑ خدا بنائے گئے۔ اس کے بیٹے قرار دیئے گئے۔ الوہیت وابنیت کی مقدس چادر اڑھا کر انہیں کس طرح مافوق البشر منوایا گیا۔ قرآن کریم اس خطرناک چور دروازہ کو سیسہ پلائی ہوئی دیواروں سے بند کرنا چاہتا تھا۔ آپ کسی سورۃ کو دیکھیے۔ لفظاً معناً۔ مجملاً تفصیلاً۔ اس غلط عقیدہ کے ہر گوشہ کی تردید اسمیں موجود ہو گی۔ یعنی قرآن کریم میں جس درجہ خدا کی

توحید پر مختلف عنوانات سے زور دیا گیا ہے۔ اسی وجہ رسولوں کی بشریت بھی متنوع اعتبارات سے بے نقاب کی گئی ہے۔ انھیں بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کہا گیا۔ (۶ : ۱۸) انہیں خدا کا عبد کہا گیا۔ وہ ہدایت بھی کرتے تھے تو اپنے مالک حقیقی کے حکم سے ہی کرتے تھے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاۤءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ۔ (۲۱:۷۳) اور ہم نے ان کو امام و پیشوا بنایا جو لوگوں کو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کو نیکی کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی۔ اور وہ سب ہماری بندگی کرتے تھے

وہ خود خدا کے دروازے کے بھکاری ہوتے تھے۔

فَقَالَ رَبِّ اِنِّيْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ۔ (۲۸:۲۴) اور (موسیٰ) نے کہا کہ پروردگار! آپ جو کچھ بھی بہتری میرے لیے بھیجیں، میں اس کا محتاج ہوں۔

انھیں اپنی ذات تک کے لیے نفع ونقصان کا اختیار نہ ہوتا تھا۔

وہ تم کہدو کہ میں اپنی ذات کے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ مگر جو اللہ چاہے۔ اگر میں غیب کے امور سے واقف ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا۔ اور کوئی مضرت مجھ پر واقع نہ ہوتی۔ میں تو صرف ایمان والوں کے لیے نذیر و بشیر ہوں۔ ۱۸۸:۷

جو وحی ان پر نازل ہوتی تھی وہ خود اس پر ایمان لاتے تھے وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ۔ اور اس کی اتباع کرنے پر اسی طرح مامور تھے جس طرح اور ماننے والے۔ (اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ (۱۰:۱۵) ہر چند اللہ تعالیٰ نے اپنے حفظ امن میں لے کر ان کو ایسا بنایا تھا کہ ان سے معصیت کا سرزد ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ لیکن ان کی بشریت و عبودیت کو پختہ ترین طریق پر واضح کرنے کے لیے یہاں تک بھی فرما دیا کہ بفرض محال اگر یہ بھی شرک و معصیت کریں تو ان پر بھی اسی طرح عذاب ہو جس طرح دوسرے انسانوں پر (۱۲ : ۲۶ (۱۵ : ۱۰) نہیں۔ بلکہ ان کو عام لوگوں سے

دگنا عذاب ہو۔

"اگر (بفرض محال) ہم تمہیں ثابت قدم نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے اور اس صورت میں ہم تمہیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دگنا عذاب دیتے اور کوئی ہمارے خلاف تمہارا مددگار نہ ہوتا۔ (۱۷: ۷۴)

کفار اعتراض پر اعتراض کرتے کہ رسول بھی ہمارے ہی جیسے انسان کیوں ہوں لیکن قرآن بار بار اس بات پر زور دئے جاتا کہ ان وہ انسان ہی ہیں اور انہیں انسان ہی ہونا چاہیے تھا۔ وہ عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

"اور کہتے ہیں کہ اس رسول کو کیا ہوا ہے کہ یہ کھانا بھی کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا بھی ہے... (۲۵: ۷)

جواب ملتا ہے کہ :-

"ہم نے تم سے پہلے بھی جس قدر رسول بھیجے وہ سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے"... (۲۵: ۲۰)

اور پھر عام انسانوں کی طرح ۔ اپنے وقت پر ۔ مدت حیات ختم کر کے اس دنیا کو چھوڑ جاتے تھے

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ الْخُلْدَ اور ہم نے تم سے پہلے کسی بشر کے لیے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا۔ أَفَإِن مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ (۲۱: ۳۴) پھر اگر تم انتقال کر جاؤ گے تو کیا یہ ہمیشہ رہیں گے۔

البتہ ان کی علمی بصیرت۔ حقائق و معارف کے اس افق اعلیٰ پر ہوتی ہے جہاں عام انسانوں کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی۔ ان کے مزکّی و مقدس نفوس کی روحانیت کائنات کے اس معراج کمال پر ہوتی ہے جہاں عام انسانوں کے شہپر تخیل کے بھی پر جلتے ہیں۔ ان کے قلب و دماغ کی یہ بلندیاں اپنی نظیر آپ ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ تمام نوع انسانی کے لیے ایک نمونہ بنا کر بھیجے جاتے ہیں۔ بایں ہمہ وہ ہوتے

انسان ہی ہیں۔ بشریت کے حدود سے خارج نہیں ہوتے۔ خدا کے عبد ہی ہوتے ہیں۔ خود معبود نہیں ہوتے اور جیسا کہ شروع میں کہا گیا ہے آتے اس لیے نہیں کہ انسانوں کو اپنی غلامی اور عبودیت سکھلائیں۔ بلکہ اس لیے کہ اپنی تعلیم و عمل سے انسانوں کو خدا کی ایسی عبودیت اور غلامی سکھائیں کہ جس سے تمام دنیا کی غلامی کے طوق و سلاسل اتر جائیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ۔ (۳:۷۹)

کسی انسان کو یہ بات زیبا نہیں کہ خدا اسے کتاب وحکمت و نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ بلکہ (وہ یہی کہے گا) کہ تم اللہ والے بن جاؤ کہ تم کتاب سکھاتے بھی ہو اور پڑھتے بھی ہو۔

حضورؐ خاتم النبیین ہو کر تشریف لائے۔ اور اس مقصد رسالت کو اس انداز سے پورا کیا کہ آپؐ کے بعد نہ کسی اور پیغام کی ضرورت باقی رہی اور نہ اس پیغام پر کسی نئے سرے سے عمل کر کے دکھانے والے کی کہ یہ پیغام ازلی یہ صوت سرمدی۔ قرآن کی دفتین میں محفوظ و مصئون چلا آتا ہے۔ کہ باطل اس کے پاس تک نہیں چھو سکتا۔ اور اس پیغام پر عمل، ان نقوش قدم کے ذرّے ذرّے سے آفتاب کی طرح روشن اور زندہ ہے کہ جن نقوش قدم سے صراط مستقیم کے نشان ادھر سے ادھر تک سیدھے ملتے چلے جاتے ہیں۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔

لیکن ذرا غور کیجیے کہ مسلمانوں نے اپنے رسول کے ساتھ کیا کیا! کیا وہی نہیں جس سے روکنے کے لیے حضورؐ تشریف لائے تھے۔ یہ احمد بے میم (احد) یہ عرب بلا عین (رب) یہانتک کہ۔

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر ۔۔۔ اتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفٰےؐ ہو کر

وہ جن کے متعلق خدا کا ارشاد تھا کہ اپنے نفع و نقصان کے بھی مالک نہیں۔ بلکہ خدا کے محتاج ہیں۔

انھیں تمام دنیا کے نفع و نقصان کا مالک و مختار قرار دیدینا۔ انھیں (معاذ اللہ) خدا بنا دینا نہیں تو اور کیا ہے؟ خدا کے عبد کو خدا کہنا۔ عجیب توحید ہے۔ جب اعتراض کیا جائے تو کہدیتے ہیں کہ صاحب! یہ صہبائے عشق و محبت کی سرمستیاں ہیں، انسان سب کچھ اپنے محبوب کو ہی سمجھتا ہے۔ عوام کی عقیدت کو جوش میں لانے کے لیے فی الواقع یہ جواب معقول نظر آتا ہے۔ لیکن سوال صرف اتنا ہے کہ امم سابقہ نے جو اپنے رسولوں کو خدا بنا لیا تھا تو کیا بغض و عناد کی بنا پر بنایا تھا؟ وہاں بھی یہی غلو محبت ہی تو تھا جس نے ان کے محبوب کو وہ کچھ بنا دیا جسے قرآن کریم نے شرک قرار دیا۔ بغض و عناد اور نفرت سے کبھی کسی نے رسولوں کو خدا نہیں بنایا۔ تو کیا پھر یہ دلیل پرلطف نہیں کہ جو کچھ پہلی امتوں نے کیا وہ شرک اور اگر وہی کچھ۔ اسی جذبہ کے ماتحت۔ مسلمان کریں۔ تو عین توحید؟ ایک ہی بیج اور ایک ہی درخت سے دو مختلف پھل لینا۔ فطرت کا مذاق اڑانا ہے۔ حضور کی محبت جزو ایمان ہے۔ ایسی محبت جو ماں باپ اولاد۔ اموال۔ بلکہ خود اپنی جان کی محبت سے بھی زیادہ ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک محبت نہ ہو۔ اتباع کامل ہو نہیں سکتا۔ جس عمل کی محرک آتش عشق ہو اس کا ایک لمحہ۔ سو سال کی ٹھنڈے پانی سے وضو کردہ سرد نمازوں سے زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ کہ یہ صرف سر جھکاتا ہے اور وہ سر کٹاتا ہے۔ یہ زندہ رہنا چاہتا ہے کہ موت کے بعد کا کھٹکا مٹ جائے۔ اور وہ مرتا ہے کہ زندگی کسی پر سے پھاور ہو کر ٹھکانے لگے۔ اسے ابھی حشر نشر۔ حساب۔ کتاب کے جھگڑے درپیش ہوتے ہیں۔ اور اس کی یہ حالت کہ تمیز ہی نہیں کیا جا سکتا کہ تلوار رگ جاں سے پہلے چھوئی تھی 'یا جان باب جنت سے۔ ؎

عشق نے اک جست میں طے کر دیے قصے تمام
اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

لیکن صہبائے عشق کی سرمستیوں میں حفظ مدارج و مراتب بھی قرآن ہی نے سکھایا ہے۔ جو کہ بہک گیا وہ خمخانہ یثرب کا متوالا ہی نہیں۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جنت کی شراب میں سب کچھ ہے۔ لیکن سکر نہیں ہے۔ لہٰذا۔ خدا خدا ہے۔ اور رسول۔ رسول۔ اور رسول کا رتبہ یہی ہے کہ ــــ

بعد از خدا بزرگ — تو ئی قصہ مختصر

اس سے آگے بڑھنا بھی اتنا ہی گناہ ہے جتنا اس سے پیچھے ہٹنا۔ کہ مومن ہونے کو جہاں خدا کے لیے لاالہٰ الا اللہ کی شہادت کی ضرورت ہے۔ وہاں محمد کے لیے عبدہٗ و رسولہٗ کی شہادت کی بھی۔ اور یہی ایمان و محبت کی صحیح تصویر ہے۔ اس تصویر کے صحیح رُخ کے لیے دور رسالت اور صحابۂ کبار کا طرز عمل دیکھیے حضورؐ کی عمر بھر یہی تعلیم و تلقین رہی کہ اپنے آپ کو عام انسانوں سے بلند حیثیت نہ دیں۔ اور اپنے ماننے والوں کے قلب و دماغ پر خدا بنکر نہ چھا جائیں۔ اس کے بجائے حضورؐ نے ان میں حریت فکر و نظر کی ایسی روح پھونکی کہ آج اس مزعومہ جمہوریت کے دور میں بھی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ معاملات میں خود صحابہؓ کا کئی ایک مواقع پر حضورؐ کی رائے سے اختلاف (اختلاف کی کامل آزادی) حضورؐ کی رائے کے متعلق تحقیق کہ آپنے وہ رائے یا حکم بمنصب رسول دیا ہے یا بحیثیت محمدؐ۔ یہ سب اس بات کا آئینہ دار ہے کہ حضورؐ ایک عبد مومن میں کس درجہ انسانیت کی آزادی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور اپنے ایک کا غلام بنا کر کس طرح دنیا بھر کی مادی غلامی سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ یہی تھا وہ ماحول جس میں عقل انسانی نے صحیح نشونما پائی۔ اور جس انسان کو خدا نے اس طرح پیدا کیا تھا کہ وہ حیوان کی طرح سر جھکا کر نہ چلے۔ وہ فی الحقیقت اس قابل ہو گیا کہ دنیا میں سر اٹھا کر چلے۔ اسلام انسان کو یہی سربلندیاں اور سرفرازیاں بخشنے آیا تھا۔ اور یہی اس دین فطرت کی خصوصیت تھی۔ ہم نے جب یہ خصوصیت کھو دی تو پھر وہیں جا گرے جہاں سے ابھرے تھے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ۔ کس قدر صحیح حقیقت ہے۔

ائمہ پرستی رسولوں کے بعد عوام کی عقیدت کے مرکز مذہبی پیشوا اور دین کے ائمہ ہوتے ہیں۔ قرآن کریم نے امم سابقہ کے کوائف و حالات سے ہمیں بتایا ہے کہ رسولوں کے بعد یہی لوگ ہیں جن کو خدا کا درجہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ (۹:۳۱) ان لوگوں نے خدا سے ورے ہی ۔ اپنے مذہبی علماء و پیشوایان دین کو خدا بنا لیا۔

اس کے متعلق جب نبی اکرمؐ سے عرض کیا گیا کہ حضور! یہود و نصاریٰ کبھی اپنے احبار و رہبان کو سجدے تو نہیں کیا کرتے تھے۔ تو حضور نے فرمایا کہ کیا یہ لوگ اس چیز کو حلال نہیں سمجھتے تھے جسے وہ حلال بتا دیں، اور اسے حرام جسے وہ حرام کہدیں؟ یہی ارباباً من دون اللہ بنانا ہے۔ یعنی جو منصب و حیثیت خدا کے لیے ہے وہ ان لوگوں کو دیدیں۔ یہی ان کی پرستش ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ائمۂ مذہب کی پرستش یہ ہے کہ۔

(۱) ان کے فیصلوں کو خدا کے فیصلوں کی جگہ دیدی جائے اور

(۲) ان کے ارشادات کو تنقید سے بالاتر سمجھا جائے۔

اُمم سابقہ نے ایسا کچھ اس لیے کیا تھا کہ ان کی آسمانی کتابوں کے اجارہ دار و محافظ ان کے مذہبی راہ نما تھے۔ لوگ رشد و ہدایت کے لیے ان کے محتاج تھے۔ چاہیے یہ تھا کہ لوگ ان کے فیصلوں کے لیے کتاب کی سند مانگتے لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا۔ بلکہ جو کچھ ان ارکین مذہب نے کہدیا اسے بھی فرمودۂ الٰہی سمجھ لیا۔ ظاہر ہے کہ عوام ان کے فیصلوں کو اسی لیے خدا کا فیصلہ سمجھتے تھے کہ ان کے نزدیک وہ فیصلے خدا کے احکام کے مطابق ہوتے تھے یعنی وہ ایسا باور کر لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ لوگ خدا کے فیصلوں سے بے نیاز ہو گئے اور انہی احبار و رہبان کو خدا کا قائم مقام سمجھ لیا۔ اب ان کا ہر حکم وحی منزل کی طرح واجب التسلیم اور ان کا ہر فیصلہ آیت الٰہی کی طرح بالاز تنقید قرار دیا گیا۔ اسی کو قرآن کریم نے شرک قرار دیا ہے۔

قرآن کریم نے فرمایا کہ

قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (۲:۷۲) ہدایت وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے۔

لہذا اتباع واجب قرآن ہی کی ہوئی۔ پھر

(۳) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو واضح مفصل اور آسان بنادیا کہ اس کے سمجھنے کے لیے کوئی خاص "برہمنوں" کی جماعت ہی مختص نہ ہو جائے۔

(۴) پھر قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود اللہ نے لے لی کہ قیامت تک اس میں نہ ردو بدل ہوگا نہ ترمیم و تنسیخ۔

ان بدیہیات سے ظاہر ہے کہ دین کا تقاضا ہے کہ ہر زمانہ کے مسلمان۔ قرآن کریم کی روشنی کے ماتحت عقل صحیح سے کام لے کر۔ صراط مستقیم پر چلتے جائیں۔ خود بخود منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ ان کو راستہ میں اندھوں کی طرح لاٹھی کی ضرورت ہی نہیں کہ روشنی بھی موجود ہے اور بینائی بھی لیکن غور سے دیکھیے کیا ہم واقعی اسی روش پر چل رہے ہیں؟ عوام کو تو چھوڑ دیجیے کہ اول تو وہ قرآن کریم کا مصرف بیش ازیں کچھ جانتے کہ قسم اٹھانے کے کام آتا ہے۔ اور اگر ان میں سے بعض قرآن پڑھتے بھی ہیں تو ایسے کہ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ ۔ صرف الفاظ کی تلاوت کرتے ہیں۔ خواص۔ کہ جو مذہب کے واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں۔ ان کی یہ حالت کہ کسی معاملہ کے متعلق دینی فیصلہ پوچھیے۔ بتا دیں گے کہ فلاں امام نے اس کے متعلق یہ فرمایا ہے۔ فلاں علامہ کی یہ رائے ہے نسفی میں ایسا لکھا ہے۔ شارح وقایہ کا یہ خیال ہے۔ غرض کہ ان کی سند کسی نہ کسی انسان تک جا کر رہ جائے گی۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُم مِّنَ الْعِلْمِ۔ کہیں خدا کا نام نہیں کسی جگہ قرآن کا ذکر نہیں اور اعتراض کیجیے تو جھٹ کہہ دیں گے کہ میاں! ان حضرات (علیہم الرحمۃ) نے بھی تو قرآن پڑھ کر ہی ایسا لکھا ہے۔ ان سے بڑھ کر اور کون قرآن کو سمجھ سکے گا؟ غور فرمائیے! اس جواب میں۔ اور اس میں جو یہود و نصاریٰ اپنے احبار و رہبان کے متعلق دیتے تھے۔ کیا فرق رہ جاتا ہے۔ کیا انہوں نے ان کو ارباباً من دون اللہ ایسا ہی کچھ سمجھ کر نہیں بنایا تھا۔

معاملہ یوں ہوا کہ جب اسلامی سلطنت قائم ہوئی تو سلطنت کو لامحالہ تدوین قانون کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اسلام میں چونکہ دین و دنیا الگ الگ شعبے نہیں اس لیے یہ قانون بھی مذہب ہی کی روشنی میں مرتب ہونا تھا۔ علمائے عظام اور آئمہ کرام (علیہم الرحمۃ) کہ جن کو اللہ نے قلب و دماغ کا نور عطا فرمایا تھا، جمع ہوئے۔ اور وقت کی ضروریات کو سامنے رکھکر قانون کے ضابطے مرتب کیے۔ یہ ضابطے سرکاری توثیق سے مستند کر کے عدالتوں میں بھجوا دئیے گئے کہ مقدمات کے فیصلے انہی کے مطابق ہوا کریں۔

ظاہر ہے کہ جب کسی آئینی حکومت کے ضوابط قانون مرتب ہو کر نافذ العمل ہو جائیں تو پھر سوائے حکومت کے اور کسی کو اجازت نہیں رہتی کہ وہ بھی قانون مرتب کر سکے یا ان میں ترمیم تنسیخ کر سکے۔ بعینہ جس طرح سرکاری ٹکسال کے بعد کسی کو سکہ رائج الوقت بنانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ تھی فقہ کی ابتدا۔ اور یوں دوسروں کو ایک ہی فقہ کے مطابق فیصلے کرنے پر مکلف اور اس میں کمی بیشی یا ردوبدل کرنے سے منع کیا گیا تھا۔ لیکن اس سے ظاہر ہے کہ۔

(۱) نہ تو حضرات فقہاء قیامت تک کا علم رکھتے تھے کہ ہر زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق ایک ہی وقت میں مکمل قانون وضع کر دیں۔

(۲) نہ وہ (نعوذ باللہ) خدا ہونے کا دعویٰ کرتے تھے کہ وہ استنباط مسائل میں اپنے نتائج کو تنقید سے بالاتر قرار دیدیں۔

زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان قوانین میں تبدیلی کا ہونا بھی ضروری تھا اور اس قانون پر کسی معیار اعلیٰ (قرآن کریم) کی روشنی میں تنقید بھی کی جا سکتی تھی۔ لیکن سلطنت نے جس بنا پر دوسروں کو قوانین میں ردوبدل کرنے (بالفاظ دیگر مزید اجتہاد) سے روکا تھا۔ وہ علت تو نظروں سے اوجھل ہو گئی اور بعد میں آنے والوں نے سمجھ لیا کہ بس اب تدبر و تفکر کا دروازہ باب نبوت کی طرح بند ہو گیا۔ قرآن جتنا سمجھا جانا تھا، سمجھا جا چکا۔ اس سے جو کچھ کیا جا سکتا تھا، حاصل کر لیا گیا۔ اب اس کا وجود تبرکاً

دنیا میں رہے تو رہے۔ عملی حیثیت سے امت اس سے بے نیاز ہو چکی۔ اس کے پڑھنے سے ثواب ضرور ملتا ہے لیکن اس کا سمجھنا دین پر اضافہ کرنا ہے نتیجہ اس کا ظاہر ہے کہ رفتہ رفتہ قرآن حکیم جیسی زندہ اور زندگی بخش کتاب۔ منتروں کا مجموعہ بن کے رہ گئی۔ جس سے جھاڑ پھونک گنڈہ تعویذ کا کام لیا جا سکے۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کی ادبی اور لسانی لطافتوں پر بحث کر کے اسے الفاظ کا گورکھ دھندا سمجھ لیا جائے۔ کیا یہی تھی وہ غرض جس کے لیے قرآن کریم کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی تھی؟

تدوین فقہ کا تعلق معاملات کی دنیا تک ہی تھا۔ اگر باب اجتہاد بند ہوتا تو وہ اسی حصہ تک بند ہوتا لیکن آہستہ آہستہ دین کے قصر رشید کا ہر ایک دروازہ اور کھڑکی بند کر دی گئی۔ حقائق و معارف پر بھی وہی چادر تقلید چھا گئی۔ حتیٰ کہ نوبت بایں جا رسید کہ دین سے قطع نظر، دیگر علوم و فنون میں بھی جو کچھ سلف نے لکھدیا قول فیصل اور حرف آخر سمجھ لیا گیا۔ اب زمانہ کچھ کہے آپ کی بصیرت کا تقاضا کچھ ہو، آپ نہ اس کے خلاف نہ اس سے زیادہ کچھ سمجھ سکتے ہیں جو سمجھا جا چکا، اور نہ کہہ سکتے ہیں جو کہا جا چکا۔ نہ سر میں دماغ اپنا ہو سکتا ہے۔ نہ سینے میں آپ کا دل اپنا۔ نہ آپ کی اپنی آنکھیں نہ سننے کان، اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ دنیا کہیں سے کہیں چلی گئی۔ لیکن امت مسلمہ کی سطح فہم و ادراک جو ہزار سال پہلے تھی وہی آج ہے۔

وہ سری گلی کی قیامتیں کہ لحد کے مردے اکھڑ گئے ۔۔۔ یہ مری جبین نیاز ہے کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

غور تو کیجیے کیا یہ سلف کی پرستش نہیں! کیا یہ ان کو احبار و رہبان کی طرح خدا کا درجہ دینا نہیں!! کیا ان کی نگاہ کو قیامت تک کے آنے والے واقعات کا مبصر اور تمام حالات و کیفیات کا واقف سمجھنا اور ان کے فیصلوں کو تنقید سے بالاتر قرار دینا، انھیں خدائی صفات کا حامل سمجھنا نہیں! اللہ تعالیٰ نے اللہ والے (ربانین) بننے کے لیے قرآن کریم کو ہی معیار قرار دیا تھا (۳ : ۷۸) اس نے تو قرآن کریم کو نازل فرما کر اس کی تبیین و تفصیل بھی اپنے ذمہ لے لی تھی کہ لوگ اس باب میں بھی دوسروں کے

محتاج ہو کر ان کی عبودیت اختیار نہ کریں۔

الٓرٰ ۚ كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ ۔ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ ۚ إِنَّنِي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ (۱۱: ۱-۲) ایسی کتاب کہ جس کی آیات محکم بنائی گئی ہیں پھر (اس کے ساتھ) صاف صاف بھی بیان کی گئی ہیں خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے تاکہ تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبدیت اختیار نہ کرو۔ (اور) میں تم کو اس کی طرف سے آگاہ کرنے اور بشارت دینے کے لیے (آیا) ہوں۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کی غرض کیا تلاتا ہے جو نبی اکرمؐ کے واسطہ سے دنیا تک پہنچا۔ سورۂ جاثیہ کے دوسرے رکوع میں سلسلہ کلام یوں شروع ہوتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو کتاب و حکمت و نبوت عطا فرمائی ان کو دیگر اقوام عالم پر فضیلت عطا کی، اور انہیں دین کی بینات بھی دی گئیں لیکن انہوں نے علم آجانے کے بعد باہمی ضد اور ہٹ سے اختلافات پیدا کر لیے۔ ان کے اختلافات کا تو قیامت میں فیصلہ کر دیا جائے گا لیکن دنیا کو تو ضرورت تھی کہ خدا کا وہ دین جو انسانی اختلافات کی نذر ہو کر مسخ ہو چکا تھا پھرسے دنیا کو مل جائے۔ اس کے لیے۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۔ ۴۵: ۱۸ پھر ہم نے تمہیں (اے رسولؐ) دین کی ایک شریعت پر مبعوث کیا۔ پس اس کا اتباع کرو۔ اور ان لوگوں کے خیالات کا اتباع مت کرو جن کو علم نہیں ہے۔

یہ دین و شریعت کہاں ہے۔ اس کا جواب بھی وہیں ہے۔ کہ

هَٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۔ (۴۵: ۲۰) یہ قرآن ہے جو تمام نوع انسانی کے لیے بصیرت ہے اور ایمان والوں کے لیے ہدایت و رحمت۔

قرآن ہر زمانے کے انسانوں کے لیے بصائر ہے۔ اس لیے اس میں بار بار غور و فکر۔ تدبر و تعقل کی تاکید کی گئی ہے۔ جو ایسا نہیں کرتے ان کو کہیں شرالدواب کہا گیا۔ کہیں کالانعام بتایا گیا۔ جہنم ان سے

بھری گئی۔ ان کے قلوب پر مہریں۔ ان کی آنکھوں پر پردے اور ان کے کانوں میں ڈاٹ بتائے گئے۔
کیسے کہ جو کتاب اس طرح عقل و بصیرت کو دعوت دیتی ہو جس کے لانے والے کا سب سے پہلا دعوی یہ ہو کہ
اَدْعُوْا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِ۔ اس کتاب میں کورانہ تقلید کی کہاں گنجائش ہے
جمود و تعطل وہ کب روا رکھ سکتی ہے قرآن انسانوں کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لے جانے کے
لیے آیا تھا لیکن آنکھیں بند کر کے بیٹھا رہنے والا تو خواہ ظلمت میں ہو خواہ نور میں یکساں ہے۔ علم
اجتماعی حیثیت سے قوموں میں وراثۃً منتقل ہوتا اور قومی سرمایہ کی طرح بڑھتا رہتا ہے، لیکن جو قوم
علم کی کسی خاص سطح کو منتہائے کمال سمجھ کر فارغ ہو بیٹھے اس کا مآل معلوم۔ چنانچہ وہ قوم جو دنیا
میں تمام نوع انسانی کی امامت کے لیے آئی تھی۔ ہمیشہ دنیا کے پیچھے پیچھے رہنے کی عادی ہو گئی۔ وہ ملت
جس کے ہاتھ میں اس قدر عظیم الشان قندیل دی گئی تھی کہ جس کی روشنی مشرق و مغرب کے امتیازات
ہٹا کر اقصائے عالم کو منور کرنے والی تھی۔ اب ہر جگنو کو شمع راہ سمجھ کر اس کے پیچھے لپکنے کی خوگر ہو گئی۔
یہ راستہ آسان تھا۔ اس میں سہل انگاری اور آرام طلبی تھی۔ اجتہاد کے لیے ذہنی جہاد اور اس کے ساتھ
ساتھ جسمانی مجاہدے کی ضرورت تھی۔ تقلید میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ جس کو باپ دادا کے ورثہ
سے ریاست مل جائے۔ وہ خود محنت کیوں کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس وراثت میں سکہ ان کو وہ
ملے جو اصحاب کہف کے سکہ کی طرح صدیوں پہلے کا ہو۔ درحقیقت تقلید اختیار ہی وہ قوم کرتی ہے جس
میں مجاہدانہ روح باقی نہ رہے۔ ہر قوم کی تاریخ ہمیں ایسا ہی بتاتی ہے۔ خود قرآن کریم اس پر شاہد ہے۔

> اور تم سے پہلے (بھی) کوئی رسول کسی بستی میں نہیں آیا کہ وہاں کے خوش حال (آرام طلب)
> لوگوں نے یہ نہ کہدیا ہو کہ ہم نے اپنے آباء کو ایک طریق پر پایا اور ہم انہی کے نشانات کا
> اقتدا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ (۴۳ : ۲۳)

لیکن یہ یاد رہے کہ اس مکافات عمل کے دن کہ جب "سمع و بصر و قلب" ہر ایک سے الگ الگ

بازپرس ہوگی - آپ یہ کہکر نہیں چھوٹ سکینگے کہ ہم نے فلاں امام کی تقلید کی تھی - فلاں عالم کا اتباع کیا تھا - متبوع حضرات آپ کے اس اتباع سے ہی انکار کردیں گے - کیونکہ انہوں نے کبھی کسی کو ایسے اتباع کا حکم نہیں دیا تھا

" جس وقت وہ لوگ جو متبوع تھے اپنے متبعین سے بیزار ہو جائیں گے - اور سب عذاب کا مشاہدہ کریں گے - ان کے باہمی تعلقات سب منقطع ہو جائیں گے " (۲ : ۱۶۶)

اس وقت متبعین سے پوچھا جائیگا کہ تم نے جو ان کی پرستش شروع کردی -
کیا تمہارے پاس پیغمبر بینات لے کر نہیں آئے تھے - وہ کہیں گے کہ ہاں آئے تو تھے - (۴۰ : ۵۰)
اس سے خود سمجھ لیجیے کہ مقصد کیا ہوا -

ہمارا مطلب یہ نہیں کہ سلف سے جو کچھ تمہارے پاس آیا ہے معاذ اللہ سب گمراہ کن ہے - ایسا کون کہہ سکتا ہے - مطلب صرف یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں ان سے ملا ہے آنکھیں بند کرکے اس کی پیروی نہ کرو - بلکہ شمع قرآنی کی روشنی میں ہمیشہ آنکھیں کھلی رکھو - وہ بھی تمہاری ہی طرح کے انسان تھے غلطی کرسکتے تھے لیکن قرآن کی کسوٹی کبھی غلطی نہیں کرسکتی - جو اس کسوٹی پر پورا اترے دین وہی ہے اور بس - ذلک الدین القیم -

یہ تو ائمۂ فقہ اور علمارِ سلف کی تقلید و اتباع سے متعلق تھا - ائمہ پرستی ہیں ان کے علاوہ ایک اور جماعت بھی ہے - لیکن وہ ہمارے اس موضوع سے خارج ہے - اس لیے کہ وہ اپنے ائمہ حضرات کو معصوم اور منصوص مانتے ہیں - اور اس امامت کو ایک خاندان میں مقید و محدود سمجھتے ہیں - اب ظاہر ہے کہ جس شخص کو فہم قرآن اس عقیدہ کی اجازت نہ دے اس کے نزدیک تو یہ عقیدہ سرتاسر نسل پرستی بن کے رہ جاتا ہے - اور یہ ایک ایسا بنیادی اور اصولی فرق ہے جس کی وجہ سے ہمارا ان حضرات سے تخاطب ہی بے معنی ہے - (باقی)

رسائل و مسائل

دیہات میں نماز جمعہ

پنجاب سے ایک دین دار بزرگ اپنے ایک عنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں :-

" علمائے احناف جمعہ کے لیے شہر کی شرط ابھی تک لگائے جاتے ہیں حالانکہ شہروں کی حالت اب ایسی ہوگئی ہے کہ وہاں دیہاتی مسلمانوں کو (جو تمدن جدید کے مکروہات سے ابھی بہت کچھ محفوظ ہیں) جانے سے جس قدر روکا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ میں ایک موضع کا مالک ہوں جس میں مسجد تعمیر کی ہے۔ اور ایک مکتب دینیات کا جاری کیا ہے۔ اردگرد کے دیہات میں تھوڑی تھوڑی اسلامی آبادی ہے۔ وہ جمعہ کے جمعہ یہاں نماز کو آجاتے ہیں اور قرآن شریف کا درس، جمعہ کا خطبہ اور کچھ وعظ سن جاتے ہیں۔ مدرس مکتب نماز یاد کراتا ہے اور جن کو صحیح یاد نہیں ان کی نماز صحیح کراتا ہے رمضان شریف میں مجمع بہت زیادہ ہوجاتا ہے۔ مگر علماء اس جگہ کے جمعہ کو جائز نہیں بتاتے۔ میں جمعہ کی نماز بند کردوں تو یہ لوگ ہرگز شہر کو نہ جائیں گے اگر ان کو کہا جائے کہ یہاں جمعہ نہیں ہوسکتا، جمعہ کے روز ظہر کی نماز پڑھ جایا کرو تو اسے کوئی نہیں مانتا۔ جمعہ کی عظمت اور ثواب ہی کا اثر ہے جس کے باعث یہ لوگ آٹھویں روز نماز پڑھنے آجاتے ہیں۔ مجھے فکر ہے کہ اگر یہاں جمعہ کی نماز نہ ہوئی تو دیہات کے لوگ اس تعلیم اور وعظ سے بھی محروم ہوجائیں گے۔ یہاں سے قریب چند میل کے فاصلہ پر ایک شہر ہے جہاں کئی مسجدوں میں جمعہ ہوتا ہے۔ مگر وہاں کوئی عالم صحیح خیالات کا نہیں

جس سے کسی مفید تحریک کی امید ہو۔ اور شہر کے بازاروں میں سب کچھ وہی ہے جو آج کل سب جگہ ہے۔ اور کچھ نہیں تو جو دیہاتی وہاں جائے گا وہ کچھ نہ کچھ فضول خرچی تو کر ہی آئے گا۔ میری خواہش ہے کہ جناب اس کے متعلق ضرور کچھ نہ کچھ تحریر فرمائیں۔

ترجمان القرآن۔ جمعہ کے متعلق فقہائے متاخرین جس قسم کے فتوے دے رہے ہیں، وہ اُس جمود کی روشن مثالوں میں سے ہیں جو کتاب و سنت سے اکتساب علم کرنے کے بجائے مجتہدین سلف کے اقوال پر کلی اعتماد کرنے کی بدولت پیدا ہوا ہے۔ مجتہدین سلف نے کتاب و سنت سے اکتساب علم کیا اور اپنے زمانہ کے حالات پر ان کو منطبق کرنے کی کوشش کی۔ صدیوں بعد مسلمانوں پر جو حالات آنے والے تھے لازم نہ تھا کہ ان کو بھی وہ دیکھتے اور جانتے، نہ درحقیقت ان پر بعد والوں کے لیے پیشگی اجتہاد کرنے کی کوئی ذمہ داری شرعاً یا عقلاً عائد ہوتی تھی۔ اب جو لوگ آنکھیں بند کر کے ہر ہر جزئیہ میں ان پر اعتماد کرتے ہیں اور ان کے اقوال سے سند لے کر اسقاط فرائض اور تحلیل حرام و تحریم حلال تک کا ارتکاب کر جاتے ہیں وہ درصل ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہیں جس سے خدا کے سامنے وہ سبکدوش نہیں ہو سکتے کیونکہ خدا نے ان کو قرآن و اسوۂ رسول کی پیروی کا حکم دیا ہے، نہ کہ سلف کی پیروی کا، اور سلف کی پیروی میں اگر وہ غلطی کرتے ہیں تو اس کی ذمہ داری خود ان پر ہے نہ کہ سلف پر۔ سلف نے جو کچھ اجتہادات کیے تھے وہ بلاشبہ ہماری بہترین رہنمائی کرتے ہیں اور وہ شخص بھی غلطی کرتا ہے جو ان کے علم اور ان کی بصیرت کے ثمرات کو بے کار سمجھ کر پھینک دیتا ہے۔ لیکن ان بزرگوں کی رہنمائی سے ٹھیک ٹھیک فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری نگاہوں کے سامنے بھی کتاب اللہ اور اسوۂ رسول اللہ کی شمع اسی طرح روشن رہے جس طرح سلف کے سامنے تھی، اور ہم بھی اس روشنی میں خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے اسی طرح کام لیں جس طرح ان بزرگوں نے لیا۔ ورنہ اگر ہم شمع کتاب و سنت کو اپنے سامنے سے ہٹا دیں اور عقل و فہم سے بھی کام نہ لیں اور صرف اقوال سلف کی حرف بحرف پیروی کرتے چلے جائیں تو ہم سے

ایسی غلطیاں سرزد ہوں گی جو دنیا اور آخرت دونوں میں ہم کو رسوا کردیں گی۔

اسی نماز جمعہ کے مسئلہ میں جو فقہی غلطیاں ہمارے مذہبی رہنماؤں سے زمانۂ حال میں سرزد ہوئی ہیں ان کو ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے جمعہ کی اقامت کا فرض عمومیت کے ساتھ مسلمانوں پر عائد کیا تھا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کرکے ہم کو بتایا کہ اس فرض کو کس طرح ادا کیا جائے، کون ادا کرے، کہاں ادا کرے، کون سے اشخاص اس سے مستثنیٰ ہیں، کن حالات میں یہ فرض ساقط ہوتا ہے، وغیرہ ذالک حضورؐ کے اس عمل کو دیکھ کر فقہائے امت نے مختلف احکام مستنبط کیے جن میں ایک طرف ان کی نگاہ ارشاد الٰہی و عمل رسول پر تھی اور دوسری طرف ان حالات پر تھی جن میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے، اور جن میں انھیں ان احکام کو نافذ کرنا تھا۔ من جملہ ان جزئی احکام کے جو انہوں نے اس طور پر مستنبط کیے، ایک یہ بھی تھا کہ "جمعہ ویرانوں اور جنگلوں اور عارضی قیام گاہوں میں نہ پڑھا جائے بلکہ مستقل بستیوں میں قائم کیا جائے"۔ یہ ایک عام ہدایت تھی جو ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور بعض مجمل ارشادات سے حاصل ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے غور کیا کہ بستی کی قید لگانے سے شارع کا مقصود کیا ہے اور اس کے لیے کس قسم کی بستی ہونی چاہیے اس سوال کے تصفیہ کا انحصار سراسر ان کے اپنے اجتہاد پر تھا، کیونکہ اس کے متعلق کوئی صریح ہدایت ان کو نہ ملی تھی۔ نیز اس کے تصفیہ میں اس زمانہ کے تمدنی حالات کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔ فطری طور پر ان کے درمیان اختلاف واقع ہوا۔ کسی نے کہا کہ چھوٹی سے چھوٹی بستی میں بھی جمعہ پڑھا جائے جہاں کے باشندوں سے کم از کم ۱۲ مصلی بہم پہنچ سکتے ہوں۔ کسی نے کہا کہ ایسی بستی میں جمعہ قائم کیا جائے جہاں کم از کم چالیس ایسے آدمیوں کی مستقل سکونت ہو جن پر فریضہ جمعہ عائد ہوتا ہے۔ حنفیہ نے کہا کہ جمعہ کے لیے "گاؤں" کے بجائے "شہر" ہونا چاہیے اور شہر کی تعریف میں خود حنفیہ کے درمیان بکثرت اختلافات ہوئے کیونکہ ہر امام مجتہد کے ذہن میں مقصود شارع کے لحاظ سے "بستی" کا ایک علیحدہ تصور تھا اور ہر ایک نے اپنے مخصوص تصور کے مطابق شہر کی تعریف کی تھی۔ پھر اس امر میں بھی اختلاف ہوا کہ جو لوگ بستی سے دور ہوں ان کے لیے نماز جمعہ کی منادی پر

لبیک کہنا کس حد تک فرض ہے۔ کسی نے کہا کہ جس تک منادی کی آواز پہنچتی ہو اس کو آنا چاہیے۔ کسی نے کہا کہ جو دو میل کے فاصلہ پر ہو وہ آئے۔ کسی نے چار میل کہا، کسی نے چھ میل کہا۔ کسی نے کہا کہ جو شخص جمعہ کی نماز پڑھ کر رات سے پہلے تک اپنے گھر پہنچ سکتا ہو اس پر جمعہ میں شریک ہونا فرض ہے۔ اس باب میں ہر گروہ نے ایک طرف شریعت کے اصول تیسیر کی رعایت، اور دوسری طرف فرضیت جمعہ کے مصالح اور تیسری طرف اپنے زمانہ کے وسائل حمل ونقل کی حالت پر نظر کرکے اپنی اپنی فہم کے مطابق رائے قائم کی تھی اور یہ جملہ امور ان بزرگوں کے اجتہاد پر مبنی تھے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی منصوص نہ تھی۔ مگر آج ہم سے کہا جاتا ہے کہ آپ سے ہزار برس پہلے شہریت کے تصور اور وسائل حمل ونقل کی حالت اور اقامت جمعہ کے تمدنی پہلو کو پیش نظر رکھ کر فقہاء کے ایک خاص گروہ نے جو جزئیات مستنبط کیے تھے ان کو بالکل منصوص احکام کی طرح مان لو، بلکہ ان غیر منصوص اجتہادی احکام کی بنیاد پر سرے سے اس فرض کو ساقط کر دو جو نہ صرف منصوص ہے بلکہ غایت درجہ تاکید کے ساتھ عاید کیا گیا ہے۔

ایسی ہی غلطی ہندوستان پر انگریزی تسلط کی ابتدا میں کی جا رہی تھی۔ فقہائے اسلام میں سے حنفیہ کے گروہ نے ایک دوسرا اجتہادی مسئلہ یہ بھی مستنبط کیا تھا کہ اقامت جمعہ کے لیے منجملہ اور شرائط کے ایک سلطان کا وجود بھی ہے یعنی جمعہ یا تو خود سلطان اسلام قائم کرے یا اس کا مقرر کیا ہوا حاکم۔ اس شرط کے مصالح پر کلام کرنے کا موقع نہیں۔ یہاں ذکر صرف یہ ہے کہ یہ شرط خواہ کیسی ہی مفید اور مبنی بر حکمت ہو بہرحال تھی ایک اجتہادی چیز کیونکہ کوئی واضح اور قطعی حکم اس کی تائید میں نہ تھا۔ مگر بہت سے علماء اسلام نے اس کو ویسی ہی قطعی شرط سمجھا جیسی کہ ایک منصوص شرط ہو سکتی تھی۔ اور جب ہندوستان میں اسلامی حکومت کی جگہ کفار کی حکومت قائم ہوئی تو یہ حضرات تمام مسلمانان ہند پر سے فریضہ جمعہ کو ساقط کر دینے پر آمادہ ہو گئے۔ وہ تو خدا کا شکر ادا کیجیے کہ ہندوستان میں کچھ ایسے علما بھی موجود تھے جن کے سینوں کو اللہ نے علم صحیح کیلئے کھول دیا تھا ورنہ قریب تھا کہ ہندوستان سے ہمیشہ کے لیے اقامت جمعہ کا خاتمہ ہو جاتا اور آج آپ صرف پرانے بڈھوں سے سنا کرتے کہ یہاں بھی

جمعہ کی نماز بھی ہوا کرتی تھی آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ اگر اس غلطی کا ارتکاب ہوگیا ہوتا تو مسلمانان ہند کی جمعیت کو کتنا عظیم الشان نقصان پہنچتا۔ اور کیسے سخت وبال میں یہ قوم مبتلا ہوجاتی۔ مگر ہمارے فقہاء آتنا بڑا مظلمہ اپنے سر لینے پر تیار ہوگئے محض اس اعتماد پر کہ جب خدا پوچھے گا کہ تم نے میرے مقرر کیے ہوئے فرض کو مسلمانوں کی ایک قوم پر سے کیوں ساقط کردیا، تو ہم کہدیں گے کہ صاحب ہدایہ نے لا یجوز اقامتها الا للسلطان او لمن امرہ السلطان لکھدیا تھا۔

اس بحث سے ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ فقہائے مجتہدین نے اپنے زمانہ میں کتاب وسنت سے شریعت کے جو احکام مستنبط کیے تھے، وہ بلاشبہ آج بھی ہمارے لیے نہایت مفید ہیں، اور آیندہ بھی مفید رہیں گے، مگر یہ سمجھنا کہ ان کے تمام جزئیات تمام زمانوں کے لیے اٹل قانون ہیں، اور یہ خیال کرنا کہ انکے اجتہادات بھی ویسے ہی ناقابل تغیر ہیں جیسے الٰہی احکام، اور یہ گمان کرنا کہ وہ قانون شرع کو مدون کرکے بعد آنے والی تمام نسلوں کو ہمیشہ کے لیے فکر ونظر کے استعمال اور تدبر فی الکتاب والسنہ سے بے نیاز کرگئے ہیں، ایک ایسی غلطی ہے جو ہم کو اتباع شریعت سے بہت دور لے جانے والی ہے۔

شریعت کا صحیح اتباع کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اجتہادی احکام اور منصوص احکام کے فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے، اور اجتہادی احکام کو نافذ کرتے وقت یہ دیکھ لیا جائے کہ جس خاص حالت یا خاص زمانہ میں ہم کسی حکم کو نافذ کررہے ہیں، اس میں یہ حکم شارع کے مقصود کو پورا کررہا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں کرتا تو ہمیں شارع کے مقصد کو اچھی طرح ملحوظ رکھکر اس حکم میں حسب ضرورت ترمیم کرنی چاہیے، خواہ وہ ترمیم دوسرے ائمہ مجتہدین سے ماخوذ ہو یا بالکل جدید اجتہاد پر مبنی ہو۔

یہ مقدمہ ذہن نشین کرنیکے بعد اب مسئلہ زیر بحث کی طرف رجوع کیجیے۔ یہ سوال کہ جمعہ کی نماز دیہات میں قائم کی جائے یا نہیں، بظاہر ایک بہت ہی جزئی سوال ہے، اور علمارکرام عموماً اس کے جواب میں

صرف اتنا کہدینا کافی سمجھتے ہیں کہ لا یجوز کما فی الهدایہ یا یجوز کما فی المدونہ مگر در حقیقت اس کو ٹھیک ٹھیک حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے جمعہ کی شرعی حیثیت، اور اقامت جمع سے شارع کے مقصود کو سمجھا جائے، پھر یہ دیکھا جائے کہ کتاب اللہ وسنت رسول میں اقامت جمعہ کے متعلق کیا ہدایات دی گئی ہیں اور ان ہدایات میں کیا مصالح پوشیدہ ہیں، نیز اس امر کی تحقیق کی جائے کہ ان ہدایات کی بنا پر اقامت جمعہ فی القریٰ کے جواز و عدم جواز میں ائمہ مجتہدین کے درمیان جو اختلافات ہوئے ہیں، ان میں سے ہر ایک گروہ نے شارع کے پیش نظر مقاصد و مصالح کو کس حد تک ملحوظ رکھا ہے اب انہی مقاصد و مصالح کے لحاظ سے یجوز اور لا یجوز میں سے کونسا پہلو اختیار کرنا چاہیے۔

شریعت اسلامی کے احکام میں تدبر کرنے سے یہ بات ہم کو واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ شریعت در اصل متقین و صالحین کی ایک ایسی جماعت بنانا چاہتی ہے جو زمین میں خلافت الٰہی کے فرائض کو ادا کرے، اور ایک ایسا تمدن وجود میں لائے جس میں انسانی فطرت کی بھلائیوں کو نشو و نما دینے اور برائیوں کو دبا دینے کی قوت ہو۔ اس بنیادی مقصد کی وجہ سے شریعت کے تمام احکام کا رجحان اجتماعیت کی طرف ہے۔ وہ اگرچہ اپنی پوری قوت افراد کے تزکیہ وتصفیہ پر صرف کرتی ہے، مگر اس کام میں اس کے پیش نظر محض فرد کو بحیثیت فرد پاک کرنا نہیں ہوتا، بلکہ اسے پاک کرکے ایک بہترین سوسائٹی کی رکنیت کے لیے تیار کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے افراد کے تزکیہ کے لیے جتنی تدبیریں اختیار کی ہیں وہ کم و بیش سب کی سب ایسی ہیں جو فرداً فرداً ان کا تزکیہ بھی کرتی ہیں اور اس کے ساتھ ان کو باہم جوڑ کر ایک اعلیٰ درجہ کی جماعت بھی بناتی ہیں۔ مثال کے طور پر روزے کو لیجیے۔ یہ بجائے خود صرف فرد کے تزکیۂ نفس کا ذریعہ ہے لیکن شارع نے ایک ہی زمانہ میں تیس دن کے روزے تمام مسلمانوں پر فرض کیے تاکہ وہ اسی مزکّی و مطہر حالت میں اس اجتماعی عبادت کے ذریعہ مصالحین و متقین کی ایک جماعت بن جائیں۔ زکوٰۃ کو دیکھیے اس کی تو بنیاد ہی

اجتماعیت پر ہے۔ یا ایک نفس کا تزکیہ اس طرح کرتی ہے کہ وہ دوسرے نفس یا نفوس کی امداد و اعانت کرے۔ حج کو دیکھیے۔ اس میں اجتماع کا پہلو اس قدر نمایاں ہے کہ اس کو نمایاں کرنے کی حاجت ہی نہیں۔ ان سب کے بعد نماز کو لیجیے جو ان سب سے زیادہ اہم ہے اور افراد کو صلاح و تقویٰ کی تربیت دینے کے لیے سب سے زیادہ کارگر تدبیر ہے کہ ہر روز پانچ مرتبہ وہ کام کرتی ہے جو سال میں تیس مرتبہ روزہ، اور سال میں ایک مرتبہ صدقہ اور عمر بھر میں ایک مرتبہ حج کرتا ہے۔ اس عبادت میں بھی شارع نے تربیت افراد کے ساتھ اپنے اصل مقصد یعنی مدنیت صالحہ کی تاسیس اور جماعت متعین کی تنظیم کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ روزانہ پانچ مرتبہ نماز کو باجماعت ادا کرنے کا حکم دیتا ہے، تاکہ کم یا زیادہ جتنے بھی مسلمان کہیں جمع ہوں یا جمع ہو سکتے ہوں وہ سب ملکر فریضہ ادا کریں۔ پھر وہ ہفتہ میں ایک مرتبہ ایک خاص وقت اس غرض کے لیے مقرر کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسلمان یکجا مجتمع ہوں اور مل کر باقاعدگی کے ساتھ خدا کا ذکر کریں اور اس کی عبادت بجا لائیں۔ اس ہفتہ وار اجتماع کے بعد وہ ہر سال اختتام ماہ صیام اور یادگار اسوۂ ابراہیمی جیسے اہم نفسیاتی مواقع پر ان کو اجتماع عام کی دعوت دیتا ہے تاکہ اسی عمارت کی تکمیل ہو جس کی نماز پنجگانہ تاسیس کرتی ہے اور نماز جمعہ توسیع و ترصیص۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ تمام عبادات میں شارع کا رجحان اجتماعیت کی جانب ہے اور وہ ہر عبادت میں موقع و محل کی مناسبت کے لحاظ سے انفرادیت اور انتشار کو زیادہ سے زیادہ گھٹانے اور اجتماعیت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ نماز پنجگانہ میں اس کا موقع نہ تھا کہ جماعت کو فرض کر دیا جاتا کیونکہ ہر روز ہر شخص کے لیے پانچ مرتبہ جماعت کے التزام کو فرض کر دینے میں بہت زیادہ حرج تھا۔ اس لیے صرف جماعت کی تاکید کر کے چھوڑ دیا گیا اور اجازت دے دی گئی کہ جو شخص باجماعت ادا نہ کر سکے وہ تنہا پڑھ لے۔ یہ ڈھیل جو شخصی حالات و ضروریات کے لحاظ سے دی گئی تھی اس کی تلافی کے لیے ہفتہ میں ایک مرتبہ ایک ایسی نماز فرض کی گئی جو بغیر جماعت کے

ادا ہی نہیں ہوتی یہی نماز جمعہ ہے، اور یہ فرض چونکہ اس رعایت کے نقصان کو پورا کرنے کے لیے عائد کیا گیا ہے جو نماز پنج گانہ میں انفرادیت اور انتشار کو بڑی حد تک راہ دیتی ہے، اس لیے شارع کا منشا یہ ہے کہ اس فرض کو ادا کرنے میں زیادہ سے زیادہ اجتماع ہو اور جہاں تک ہو سکے تفرق اور انتشار کو دور کیا جائے۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جمعہ کی فرضیت پر کتاب وسنت میں اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے اور اس کی اقامت کو اتنی اہمیت کس لیے دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ۔ (الجمعہ: ۲)	اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز کے لیے ندا کی جائے تو دوڑو خدا کی یاد کی طرف اور خرید و فروخت چھوڑ دو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

لقد هممت ان آمر رجلا يصلي بالناس ثم احرق على رجال يتخلفون عن الجمعة بيوتهم۔ (مسلم)	میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی جگہ کسی کو نماز پڑھانے کے لیے کھڑا کر جاؤں اور ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دوں جو جمعہ کی نماز کے لیے نہیں آتے۔
مَنْ تَرَكَ الْجُمُعَةَ مِنْ غَيْرِ ضَرُورَةٍ كتب منافقا في كتاب لا يمحى ولا يبدل (رواه الشافعي)	جو شخص بلا ضرورت جمعہ چھوڑ دے اس کا نام منافق کی حیثیت سے اس کتاب میں لکھا جائے گا جس کا لکھا نہ مٹایا جا سکتا ہے نہ بدلا جا سکتا ہے۔
مَنْ كَانَ يؤمن بالله واليوم الآخر فعليه الجمعة ..... فمن استغنى بلهو	جو کوئی اللہ اور روز آخرۃ پر ایمان رکھتا ہو اس پر جمعہ کے دن نماز جمعہ لازم ہے .... پھر جو کوئی کھیل

او تجارة استغنی اللہ عنہ واللہ غنی حمید (دار قطنی)۔
تماشے یا کاروبار کی خاطر اس سے بے پروائی برتے اللہ اس سے بے نیازی برتے گا اور وہ پاک بے نیاز ہے۔

لینتهین اقوام عن ودعهم الجمعات او لیختمن اللہ علی قلوبهم ثم لیکونن من الغافلین (مسلم)۔
لوگ جمعہ کی نمازیں ترک کرنے سے باز آجائیں ورنہ اللہ ان کے دلوں پر مہر لگا دے گا۔ پھر وہ غفلت میں مبتلا ہو جائیں گے۔

من ترک ثلث جمعات من غیر عذر کتب من المنافقین۔
جو شخص بغیر کسی عذر کے تین جمعے چھوڑ دے اس کا نام منافقین میں لکھا جائے گا۔

یہ جمعہ کے لیے دوڑنے اور کاروبار چھوڑنے کی تاکید کیوں ہے؟ یہ نبی کریم جیسے رؤف و رحیم آقا کے دل میں تارکین جمعہ کے گھروں کو آگ لگا دینے کا جذبہ کس لیے پیدا ہو رہا ہے؟ آخر جمعہ میں کیا ہے جس کی وجہ سے ترک جمعہ اور نفاق کو ہم معنی قرار دیا گیا اور اس پر اتنی سخت وعیدیں بیان فرمائی گئیں؟ اس کی علت بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ جمعہ ہی کی اقامت امت مسلمہ کا قوام ہے اور اسی نماز سے نماز پنجگانہ کے مقصد کی تکمیل ہوتی ہے، اور یہی وہ چیز ہے جس سے اسلام کا اصل مقصد حاصل ہوتا ہے یعنی مدنیت فاضلہ و جمعیت صالحہ کی تشکیل۔ اس کا ضائع ہونا گویا اسلام کے مقصد کا ضائع ہونا ہے۔ اور اس کی بنا کو منہدم کرنا اسلام کی عمارت کو ڈھا دینا ہے۔

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اس سے دو باتیں معلوم ہوگئیں:۔

ایک یہ کہ جمعہ کی فرضیت عام نمازوں کی فرضیت سے زیادہ موکد ہے اور اس کی اقامت اسلام کے مقاصد اصلیہ کی تکمیل کے لیے غایت درجہ اہمیت رکھتی ہے، لہذا فروعی و اجتہادی مسائل میں ان پہلوؤں سے بچنا چاہیے جن سے جمعہ ضائع ہوتا ہو اور ان پہلوؤں کو اختیار کرنا چاہیے جن سے جمعہ قائم ہوتا ہو۔

دوسرے یہ کہ اقامت جمعہ میں شارع کے پیش نظر مدنیت و اجتماعیت ہے، اور وہ اس ذریعہ سے

وحشت اور انتشار کو دور کر کے اہل ایمان کو اجتماع اور ائتلاف کی طرف لانا چاہتا ہے۔ لہذا جمعہ کو قائم کرنے میں اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جماعتیں منتشر نہ ہوں بلکہ زیادہ سے زیادہ اجتماع ہو۔

اب آگے بڑھیے کتاب اللہ میں جمعہ کی فرضیت اور اس کی تاکید تو اس قوت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اس کی طرف دوڑنے اور اس کے لیے سب کاروبار چھوڑ دینے کا حکم ہے فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ۔ مگر ان سوالات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی کہ یہ نماز کب پڑھی جائے۔ کہاں پڑھی جائے اور کہاں نہ پڑھی جائے، کون پڑھے اور کون نہ پڑھے، کن حالات میں پڑھی جائے اور کن میں نہ پڑھی جائے، ان سب سوالات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر چھوڑ دیا گیا اور اہل ایمان سے صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ جب پکارا جائے جمعہ کی نماز کے لیے۔

مذکورہ بالا سوالات کے متعلق تفصیلی ہدایات ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ کے متواتر عمل سے ملتی ہیں:۔ اور مزید روشنی ان بزرگوں کے اقوال اعمال سے حاصل ہوتی ہے جنہوں نے براہ راست حضور سے تعلیم پائی تھی۔ ان ذرائع سے ہم کو قطعی طور پر جو باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے جمعہ کی نماز ہمیشہ ظہر کے وقت پڑھی ہے لہذا جمعہ کا وقت ظہر کا وقت ہے۔

(۲) آپ نے اور آپ کے صحابہ نے کبھی خطبہ کے بغیر جمعہ نہیں پڑھا۔ لہذا جمعہ کی نماز کیساتھ خطبہ ضروری ہے۔

(۳) جمعہ کی فرضیت سے غلام عورتیں بچے مسافر اور مریض مستثنیٰ ہیں۔ فرض جن پر عائد ہوتا ہے وہ صرف ایسے عاقل و بالغ مرد ہیں جو آزاد ہوں اور صحیح و تندرست ہوں۔

(۴) عہد نبوی اور عہد صحابہ میں جمعہ کبھی ویرانوں اور جنگلوں اور عارضی فرودگاہوں (خیام وغیرہ)

میں نہیں پڑھا گیا، لہذا اقامت جمعہ کیلیے ایسی جگہ ہونی چاہیے جہاں مستقل آبادی ہو۔

(۵) جمعہ کبھی پرایویٹ مکانوں میں نہیں پڑھا گیا بلکہ ہمیشہ ایسی جگہ پڑھا گیا ہے۔ جہاں مسلمانوں کو ہر کسی حاضر ہونے کی آزادی، ہو، لہذا جمعہ کے لیے اذن عام ضروری ہے۔

یہ وہ امور ہیں جن پر تمام امت کا اتفاق ہے، کیونکہ یہ قطعی طور پر ثابت ہیں، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا۔ ان کے علاوہ جتنے جزئی امور ہیں ان میں سے کوئی بھی قطعی طور پر ثابت نہیں ہے۔ اس لیے ان میں فقہاء کے درمیان بکثرت اختلافات ہوئے ہیں مثلاً یہ کہ نصاب جماعت کیا ہو؟ جمعہ کون قائم کرے؟ خطبے دو ہونے چاہئیں یا ایک کافی ہے؟ وقس علی ہذا۔ اسی قبیل سے ایک سوال یہ بھی ہے کہ جمعہ کے لیے کس قسم کی بستی ہونی چاہیے اور اس بستی سے کتنے فاصلہ تک کے لوگوں کو نماز کے لیے آنا چاہیے۔

امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ ایسے قریوں میں جمعہ ناجائز ہے جن کے باشندے گرمی یا جاڑے میں کہیں اور منتقل ہو جاتے ہوں۔ ان کے سوا ایسے تمام قریوں میں جمعہ کی نماز ہو سکتی ہے جن میں چالیس یا اس سے زیادہ عاقل و بالغ آزاد مرد موجود ہوں۔ اس کی تائید میں وہ اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جو ابن عباس سے مروی ہے کہ مدینہ کے بعد پہلا جمعہ جو پڑھا گیا وہ بحرین کے ایک قریہ جواثی میں تھا۔ نیز وہ روایت بھی ان کے لیے دلیل ہے کہ حضرت عمر نے اہل بحرین کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے لکھا کہ جمعہ ادا کرو جہاں کہیں بھی ہو۔ مگر ان میں سے پہلی روایت میں محض قریہ کا لفظ ہے۔ جس کا کوئی مفہوم متعین نہیں کم از کم اس سے چالیس مردوں کی قید تو کسی طرح نہیں نکلتی اور ہم کچھ نہیں جانتے کہ امام صاحب کے نزدیک اس قید کا ماخذ کیا ہے۔ رہی دوسری روایت تو وہ جس قدر امام صاحب کی تائید میں ہے۔ اسی قدر ان کے خلاف بھی ہے۔ اس سے تو جنگل اور ویرانے میں بھی اقامت جمعہ کا جواز نکالا جا سکتا ہے، حالانکہ امام صاحب اس کے ناجائز ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔

امام احمد کا مسلک۔ امام شافعی سے ملتا جلتا ہے اور ان کے دلائل بھی وہی ہیں۔

امام مالک کے نزدیک جمعہ کی نماز ہر ایسے قریہ میں ہو سکتی ہے جس کی آبادی مستقل ہو، خواہ اُسکی آبادی چالیس مردوں سے بھی کم ہو۔

امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جمعہ صرف مصر یعنی شہر میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ دیہات میں قائم کرنا جائز نہیں۔ ان کا استدلال ایک تو اس روایت سے ہے جو حضرت علی سے منقول ہے کہ لا جمعۃ ولا تشریق ولا فطر ولا اضحیٰ الا فی مصر جامع۔ نیز وہ اس بات سے بھی دلیل لاتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب ممالک فتح کیے تو دیہات میں کہیں بھی منبر نصب نہیں کیے۔ یہ گویا جمعہ کے لیے مصر کے شرط ہونے پر صحابہ کا اجماع ہے لیکن مصر کی تعریف میں خود حنفیہ کے درمیان بہت اختلافات ہیں حتیٰ کہ خود امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے بھی دو مختلف قول ہیں۔ مثال کے طور پر چند اقوال ملاحظہ ہوں:۔

(۱) مصر جامع وہ ہے جہاں امیر اور قاضی ہو جو احکام نافذ کرے اور حدود جاری کرے۔

(۲) جہاں کی سب سے بڑی مسجد میں اگر سب باشندے جمع ہوں تو سما نہ سکیں۔

(۳) جہاں بازار اور شوارع اور محلے ہوں اور کوئی حاکم ایسا ہو جو ظالم سے مظلوم کا انصاف لے، اور کوئی عالم ایسا ہو جس کی طرف مسائل میں رجوع کیا جا سکے۔

(۴) امام جس مقام کو مصر قرار دے اور اقامت جمعہ کا حکم کرے۔

(۵) جہاں ہر پیشہ کا آدمی اپنے پیشہ سے بسر اوقات کر سکتا ہو۔

(۶) جس کی آبادی دس ہزار ہو۔

(۷) جس کی آبادی تین ہزار سے کم نہ ہو۔

اس قسم کی بیسیوں تعریفیں اور بھی ہیں جو فقہاء نے بیان کی ہیں۔

اب یہ امر غور طلب ہے کہ اول تو "مصر" کے شرط ہونے پر امت کا اجماع نہیں بلکہ محدثین اور

فقہاء کی ایک کثیر جماعت اس سے اختلاف رکھتی ہے، دوسرے یہ شرط اگر ثابت بھی ہو تو واضح طور پر یہ معلوم نہیں کہ مصر کہتے کس کو ہیں۔ ایسی حالت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قسم کی مختلف فیہ اور مبہم شرط کے فقدان پر کیا نماز جمعہ جیسے موکد اور اہم فریضہ کو مسلمانوں پر سے ساقط کر دینا درست ہے؟ جو لوگ صرف فقہائے متقدمین کی عبارات پر اعتماد کرتے ہیں، اور جن کی نظر کتب فقہیہ کے الفاظ سے آگے نہیں جاتی ان کے لیے یہ فتویٰ دینا بہت آسان ہے کہ فلاں مقام چونکہ "مصر" نہیں ہے لہٰذا وہاں کے باشندوں پر سے جمعہ کا فرض ساقط ہے لیکن ایک طرف تقویٰ اور دوسری طرف تفقہ اس کا مقتضی ہے کہ اسقاطِ فرض کی جرأت کرنے سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے اختلافات کا منشا کیا ہے۔ اور انہوں نے شارع کے مقصد کو پورا کرنے کے لیے جو مختلف صورتیں اختیار کی ہیں ان کی اصلی روح کیا ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں اقامت جمعہ میں دو امور بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک جمعہ کی فرضیت، جو عام نمازوں سے بھی زیادہ موکد ہے، اور ہر عاقل بالغ آزاد و تندرست مرد پر عائد ہوتی ہے۔ دوسرے اجتماعیت جس کا مقصد انتشار کو دور کرنا اور مسلمانوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ اجتماع اور تالف پیدا کرنا ہے۔ ائمہ مجتہدین میں سے ہر ایک نے ان دونوں پہلوؤں پر نظر رکھی ہے، اور دونوں کو مرعی رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن اس معاملہ میں اشکال یہ واقع ہوتا ہے کہ بعض حالات میں یہ دونوں پہلو جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر فرضیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تو اجتماعیت کا پہلو چھوٹ جاتا ہے، کیونکہ فرضیت کا تقاضا یہ ہے کہ دو چار آدمی بھی جہاں موجود ہوں، وہیں فرض ادا کر دیا جائے۔ اور اگر اجتماعیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تو فرضیت کا پہلو کمزور ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں کافی اجتماع نہ ہو وہاں افراد پر سے فرض ساقط کر دیا جائے۔ ائمہ مجتہدین نے اس اشکال کو دور کرنے کے لیے دونوں پہلوؤں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ امام شافعی اور

امام احمد نے چالیس کو شارع کا دوسرا مقصد پورا کرنے کے لیے کافی سمجھا چنانچہ ہر ایسے قریہ میں اقامت جمعہ کا حکم دیدیا جہاں اجتماع کا یہ نصاب پورا ہوتا ہو، اور فتویٰ دیا کہ اس قریہ سے جہاں جہاں تک اذان کی آواز پہنچتی ہو وہاں کے ہر بالغ اور آزاد مرد پر نماز کے لیے آنا فرض ہے۔ امام مالک اجتماع کے لیے کم سے کم ۱۲ آدمیوں کی موجودگی کو کافی سمجھتے ہیں، اس لیے انہوں نے اور بھی زیادہ چھوٹے قریوں میں اقامت جمعہ کا حکم دیا اور ان سب لوگوں پر جمعہ کی حاضری لازمی قرار دی جو مقام جمعہ سے چھ میل کی حد میں ہوں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ نے محسوس کیا کہ اس طرح قریہ قریہ میں اقامت جمعہ کی اجازت دینے سے انتشار پیدا ہوتا ہے، اور اجتماع سے شارع کا جو مقصد ہے وہ پوری طرح حاصل نہیں ہوتا۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ عراق و شام وغیرہ ممالک میں، جہاں عہد صحابہ کے آثار اس وقت تک بالکل تازہ تھے، کہیں دیہات میں منابر اور جوامع نہیں پائے جاتے۔ ان تک حضرت علی کا وہ اثر بھی پہنچا جس میں تصریح ہے کہ جمعہ صرف امصار (شہروں) میں قائم کیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی سنا کہ جب حجاج نے اھواز میں جمعہ قائم کیا تو امام حسن بصری نے فرمایا لعن اللہ الحجاج یترک الجمعۃ فی الامصار ویقیمہا فی حلاقیم البلاد" خدا کی لعنت ہو حجاج پر یہ کم بخت شہروں کو چھوڑ کر ملک کے گوشوں میں جمعہ قائم کرتا ہے" ان سب باتوں پر نظر کر کے انہوں نے فتویٰ دیا کہ ہر علاقہ کے صدر مقام میں جمعہ قائم کیا جائے اور جن جن لوگوں پر جمعہ کا فرض عائد ہوتا ہو وہ سب مضافات سے صدر مقام پر اکٹھے ہو جایا کریں۔

اب ہمیں ایک نظر اس زمانہ کے حالات پر بھی ڈالنی چاہیئے وہ اسلامی حکومت کا زمانہ تھا جگہ جگہ پرگنوں اور قصبوں میں قاضی اور اصحاب شرط (کوتوال) مقرر تھے جو خصومات کے فیصلے کرتے اور مظالم کی داد رہی کرتے تھے۔ ایک کثیر جماعت کے مجتمع ہونے میں چونکہ فتنہ و فساد پیدا ہونیکا بھی احتمال ہے اس لیے اجتماع کی غرض سے ایسی ہی جگہ زیادہ مناسب تھی جہاں امن قائم کرنے والے موجود

ہوں۔ پھر اکابر احناف کا زمانہ وہ تھا جب عراق اور الجزیرہ اور فارس وغیرہ ممالک کی آبادی بہت زیادہ اور گھنی تھی۔ قصبات اور دیہات کثرت آبادی کے سبب سے باہم پیوستہ ہو گئے تھے۔ تمدن بھی انتہائی عروج پر تھا۔ صنعت و حرفت اور تجارت کے فروغ نے قصبوں کو بھی شہر بنا دیا تھا۔ انہی وجوہ سے "شہر" کی وہ تعریفیں کی گئیں جو آپ نے اوپر دیکھی ہیں۔ ورنہ فی نفسہٖ قاضی اور کوتوال یا بازار اور شوارع یا دس ہزار اور تین ہزار کی آبادی کو فرضیت جمعہ کے اشتراط میں کوئی بھی دخل نہیں۔ اصل شرط "مصر" ہے۔ اور اس کے مدلول کو متعین کرنے کے لیے ہر فقیہ مجتہد نے وہ خصوصیات بیان کی ہیں جو اس کے پیش نظر امصار میں پائی جاتی تھیں۔ ان خصوصیات سے قطع نظر کر کے اگر دیکھا جائے کہ وہ چیز کیا ہے جس کی بنا پر "مصر" کو شرط جمعہ قرار دیا گیا ہے، تو معلوم ہوگا کہ وہ "مرکزیت" اور صرف مرکزیت ہے۔ جو مقام کسی علاقہ کا صدر مقام ہو یا جمعہ کی غرض کیلیے صدر مقام بنا لیا جائے وہ "مصر" ہے اور اس کے سوا دوسرے مقامات پر اقامت جمعہ کا ناجائز ہونا اس معانی میں نہیں ہے کہ ان مقامات کے لوگوں سے جمعہ کا فرض ساقط ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو جمعہ کے لیے صدر مقام پر آنا چاہیے۔ اگر بغیر عذر شرعی کے وہ نہ آئیں گے تو گنہگار رہوں گے۔

اس باب میں فقہا حنفیہ کے اقوال کی چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کی شرط عائد کرنے اور دیہات میں اقامت جمعہ کو ناجائز قرار دینے سے ان کا منشا بھی وہی تھا جو ہم نے سمجھا ہے علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:۔

ولو مصر الامام موضعاً وامرھم بالاقامة فیه جاز (فتح القدیر ص ۴۰۹) — اگر امام کسی مقام کو مصر قرار دے دے اور لوگوں کو جمعہ پڑھنے کا حکم دے تو جائز ہوگا۔

یہاں "مصر قرار دینے" کا مجاز امام کو ٹھیرایا گیا ہے، اس لیے کہ صحیح معنوں میں اسلامی زندگی

بغیر امام اور امیر کے ہو نہیں سکتی۔ لیکن جہاں بدقسمتی سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں امامت و امارت کا منصب باقی نہ رہا ہو، وہاں امام مالک رحمۃ اللہ کے اصول پر مسلمانوں کی جماعت باہمی اتفاق سے وہ سب کام کر سکتی ہے جو شرع میں امام سے متعلق کیے گئے ہیں، یعنی بالفاظ دیگر ایسے حالات میں مسلمانوں کا اتفاق رائے امام کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ پس اگر ایک دیہاتی علاقہ کے مسلمان باہمی اتفاق سے اپنے علاقہ کے کسی بڑے گاؤں یا قصبہ کو جہاں مسلمانوں کی آبادی نسبتاً زیادہ ہو اور جہاں کوئی بڑی مسجد بھی موجود ہو، جمعہ کی اغراض کے لیے "مصر" قرار دے لیں تو وہ مقام "مصر" ہی ہوگا خواہ اس پر مصر کی اُن تعریفات میں سے کوئی تعریف صادق نہ آئے جو کتب فقہیہ میں مذکور ہیں۔

آگے چل کر علامہ موصوف لکھتے ہیں:

ومن كان في توابع المصر فحكمه حكم
اهل المصر في وجوب الجمعة عليه
بان ياتي المصر فليصليها فيه و
اختلفوا فيه فعن ابي يوسف .....
انها تجب في ثلاثة فراسخ وقال
بعضهم قدر ميل وقيل قدر ميلين
وقيل ستة اميال وعن مالك ستة
وقيل ان امكنه ان يحضر الجمعة
ويبيت باهله من غير تكلف تجب عليه
الجمعة والا فلا قال في البدائع و
هذا حسن (فتح القدير ج ۱ ۔ ص ۴۱۲)

اور جو شخص مصر کے مضافات کا رہنے والا ہو اس پر بھی اہل مصر کی طرح جمعہ فرض ہے اور لازم ہے کہ وہ وہاں جا کر نماز پڑھے۔ مضافات کی حد میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے ابو یوسف کہتے ہیں .... کہ وہ تین کوس کی حد میں واجب ہے بعض نے ایک میل، بعض نے دو میل، بعض نے چھ میل کی حد قرار دی ہے۔ امام مالک نے بھی ۶ میل کہا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جمعہ میں شریک ہونے کے بعد رات آنے سے پہلے بلا کسی زحمت و تکلیف کے اپنے گھر پہنچ سکتا ہو اس پر جمعہ کی حاضری واجب ہے ورنہ نہیں۔ صاحب بدائع نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔

بعض احادیث سے بھی اس موخرالذکر قول کی تائید نکلتی ہے۔ چنانچہ ترمذی نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے۔

عن النبی صلعم قال الجمعۃ من آواہ اللیل الیٰ اھلہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ اس پر فرض ہے جو رات تک اپنے بال بچوں میں پہنچ سکتا ہو۔

بخاری میں ہے:۔

عن عائشۃ زوج النبی قالت کان الناس ینتابون الجمعۃ من منازلھم والعوالی فیاتون فی الغبار فیصیبھم الغبار والعرق فیخرج منھم العرق فاتی رسول اللہ صلعم انسان منھم وھو عندی فقال لو انکم تطھرتم لیومکم ھذا۔

حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ لوگ اپنی فرودگاہوں اور عوالی سے نماز جمعہ کے لیے آیا کرتے تھے اور ان پر گرد اور پسینہ کی تہیں چڑھ جاتی تھیں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف رکھتے تھے کہ ان لوگوں میں سے ایک شخص آپ کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے فرمایا بہتر ہو اگر تم اس دن غسل کر لیا کرو۔

پہلی حدیث تو صاف ہے رہی دوسری حدیث تو اس میں یہ ذکر ہے کہ لوگ شرکت جمعہ کے لیے عوالی سے آیا کرتے تھے۔ عوالی ان دیہات کا نام ہے جو مدینہ طیبہ کے مضافات میں واقع تھے اور علامہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ یہ دیہات مدینہ سے چار میل اور اس سے زیادہ مختلف فاصلوں پر تھے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ عوالی سے اونٹ پر یا پیدل جمعہ کے لیے آتے ہوں گے وہ اس زمانہ میں شام تک لگ بھگ ہی اپنے گھروں کو واپس پہنچتے ہوں گے۔ یہ اس زمانہ کی کیفیت ہے جب بسیں اور لاریاں چلتی نہ تھیں سائکلیں اور موٹر سائکلیں بھی نہ تھیں۔ ریل کا بھی وجود نہ تھا۔ پختہ سڑکیں تک نہ تھیں۔ اس زمانہ میں جب لوگوں کو چھ چھ میل کے فاصلوں سے آنے کے لیے کہا گیا تو آج جبکہ حمل ونقل کی آسانیاں بہت بڑھ گئی

ہیں لوگوں کے لیے بیس بیس میل سے بھی جمعہ کے لیے آنا کچھ مشکل نہیں۔ تاہم اختلاف احوال کو پیش نظر رکھکر یہ مناسب نہیں کہ فاصلہ کی مقدار میلوں کے حساب سے متعین کی جائے بلکہ وہی قید بہتر ہے جو شارع نے بیان فرمائی ہے، یعنی جو شخص نماز کے بعد مغرب تک اپنے گھر بآسانی پہنچ سکتا ہو وہ اپنے علاقہ کے صدر مقام میں جاکر جمعہ پڑھے، اور جو نہ پہنچ سکتا ہو وہ اپنے ہی گاؤں میں ظہر پڑھ لیا کرے۔

اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ فقہاء کرام نے مصر کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ بالکل ناقابل لحاظ نہیں ہیں کسی دیہاتی علاقہ کے مسلمان جب اپنے علاقہ کے کسی قصبہ کو جمعہ کی اغراض کے لیے "مصر" قرار دینا چاہیں تو انھیں انتخاب میں حسب ذیل امور کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

(۱) وہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ سے زیادہ ہو۔

(۲) کوئی بڑی مسجد موجود ہو جس میں زیادہ سے زیادہ اجتماع ہو سکتا ہو۔

(۳) کوئی ایسا عالم موجود ہو جو مسائل شرعیہ کی تعلیم دے سکے اور وعظ و تذکیر کی اچھی قابلیت رکھتا ہو

(۴) جہاں سرکاری حکام میں سے کوئی ایسا حاکم موجود ہو جو امن قائم رکھنے کا ذمہ دار ہو۔

یہ امور اقامت جمعہ کے شرائط میں سے نہیں ہیں، بلکہ مقام جمعہ کے انتخاب میں ان کو ملحوظ رکھنا انسب اور اولیٰ ہے۔ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔

مطبوعات

تفسیر سورۂ کوثر تالیف مولٰنا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ۔ ترجمہ مولٰنا امین احسن اصلاحی ضخامت تقریباً سوا سو صفحات قیمت ۸ر۔ دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر (ضلع اعظم گڈھ)۔

ناظرین ترجمان القرآن کو یاد ہوگا کہ مولانا حمید الدین مرحوم کی اس تفسیر کا ترجمہ ان صفحات میں باقساط شائع ہو چکا ہے۔ اب وہی چیز ایک مستقل رسالہ کی صورت میں دائرہ حمیدیہ سے شائع ہوی ہے مصنف علّام نے عموماً قرآن مجید کی چھوٹی چھوٹی صورتوں کے اسرار و معارف بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں اور ان کے عمود نظم کلام موقع و محل اور جامع الفاظ پر اس قدر پھیل کر نگاہ ڈالی ہے کہ ہر سورت اکثر و بیشتر مضامین قرآنی کا ایک جامع خلاصہ نظر آنے لگتی ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ سورۂ کوثر کی تفسیر میں وہ اپنی انتہائی کمال کو پہنچ گئے ہیں۔ معنی کوثر کی تحقیق، عطیۂ کوثر کے بعد ہی صلوٰۃ اور نحر کا حکم دینے کی حکمت، پھر صلواۃ و نحر کے باہمی تعلق، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو نعمت کوثر سے سرفراز کرنے کے ساتھ کفار کو ابتر قرار دینے کی وجہ اور اس سے فتح مکہ کی کھلی ہوئی بشارت نکلنے پر انہوں نے غایت درجہ بالغ نظری کے ساتھ کلام کیا ہے اور ایسے ایسے نکات بیان کئے ہیں کہ اس چھوٹی سی صورت کی عظمت کا سکہ دل پر بیٹھ جاتا ہے حالانکہ یہ وہی سورت ہے جس کو لوگ یونہی روا روی میں پڑھ جاتے ہیں مولٰنا نے فصل لربك وانحر کی جو تفسیر بیان فرمائی ہے، اسے خاص طور پر ان حضرات کو غور سے پڑھنا چاہیے جو آج کل قربانی کو ایک مہمل اور فضول رسم قرار دے رہے ہیں اور اسلامی زندگی کے پروگرام سے اس کو خارج کر دینا چاہتے ہیں۔

تفسیر سورہ طب تالیف مولٰنا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ۔ ترجمہ مولٰنا امین احسن اصلاحی ضخامت ۴۲ صفحات قیمت ۶ر۔ دائرۂ حمیدیہ۔ سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ)۔

قرآن مجید کی اس سورۃ پر دشمنان اسلام کا پرانا اعتراض ہے کہ یہ سراسر کوسنے اور گالیوں پر مشتمل ہے اور کوسنے اور گالیاں دینا خدا کی شان سے بعید ہے۔ علامہ حمید الدین کی تفسیر اس اعتراض کا پوری طرح قلع قمع کر دیتی ہے، اور سورۂ لہب کا اصلی حسن تفسیر کے آئینہ میں چمکتا نظر آتا ہے۔ انہوں نے ثابت کیا ہے کہ یہ سورۃ دراصل بددعا نہیں بلکہ ایک ایسی پیشین گوئی ہے جو حرف بحرف صحیح نکلی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ کفار قریش میں سے خاص طور پر ابولہب کو ہلاکت اور تباہی کی پیشین گوئی کے لیے چن لینے اور پھر اس کے ساتھ اس کی بیوی کا ذکر کرنے کی کیا وجہ ہے، اور ان دونوں میاں بیوی کے لیے سیصلیٰ نارًا ذات لہب اور حمالۃ الحطب اور فی جیدھا حبلٌ من مسد کی جو سزائیں قیامت کے روز تجویز کی گئی ہیں وہ ان دونوں کے کیرکٹر سے کیا مناسبت رکھتی ہیں۔

اسباق النحو تالیف مولٰنا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ۔ ضخامت ۱۵ صفحات قیمت درج نہیں۔ غالباً ۲ر ہو گی۔ دائرہ حمیدیہ، سرائے میر (اعظم گڈھ)

اس کتاب میں مولٰنا نے عربی زبان کے قواعد کو انتہائی سہل انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے قواعد داں تھے۔ اور انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اس فکر میں صرف کیا تھا کہ عربی زبان کی تحصیل کو زیادہ سے زیادہ سہل کیا جائے تاکہ اس کی تعلیم عام ہو سکے۔ یہ کتاب اسی فکر اور کاوش کا نتیجہ ہے۔ ہمارے پاس اس کا صرف وہ حصہ آیا ہے جس میں اسم کا بیان ہے فعل اور حرف کا بیان بعد کے رسائل میں ہے جو ہماری نظر سے نہیں گذرے۔ تاہم حصۂ اول ہی کے مطالعہ سے ہم کو یقین ہو گیا کہ عربی زبان کی تعلیم کے لیے یہ سلسلہ نہایت مفید ثابت ہو گا۔

دفتر ترجمان القرآن کو اس رسالہ کے حسب ذیل نمبروں کی ضرورت ہے جو حضرات ان کو بقیمت علیٰحدہ کرنا چاہیں وہ دفتر سے مراسلت کریں۔

محرم، شعبان، رمضان ۵۲ھ۔ محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی ۵۳ھ۔ منیجر

اُردو زبان کی ایک پُرشکوہ کتاب

تمدنِ عرب

جو مدتوں سے نایاب تھی پہلے اڈیشن ۱۸۹۸ء

کی ہو بہو صفحہ بہ صفحہ جامع خصوصیات کے ساتھ طبع ہو رہی ہے (۱۴۵) امیرکن بلاک (۶۵۱) صفحے اعلیٰ کاغذ
نفیس چھپائی بہترین سنہری جلد فرانس کے مایۂ ناز مورخ ڈاکٹر گستاؤلی بان کی اصل کتاب کا ترجمہ

مولوی سید علی بلگرامی مرحوم کا بےمثل علمی کارنامہ

جس کی پچاس روپیہ قیمت تھی — مگر ایک سو روپیہ میں بھی نہیں مل سکتی تھی

اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن (مدظلہ) کے

جشن سیمین کی شادمانی میں غرۂ ذی حجہ سنہ ۱۳۵۴ھ تک شائع ہو جائے گی

پیشگی رعایتی قیمت بیس روپئے بعد طبع پچیس روپئے

جامعہ عثمانیہ کی جملہ مطبوعات ہر قسم کی نادر روزگار کتابوں کے لئے

سید عبدالقادر

پبلشر گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹر و پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن کا (پتہ یاد رکھیں)